کینوس کے رنگ

ڈاکٹر سلمان عباسی

جملہ حقوق بحق مصنف

نام کتاب	کینوس کے رنگ
نام مصنف	ڈاکٹر سلمان عباسی
نام ناشر	ڈاکٹر سلمان عباسی
سال اشاعت	سنہ ۱۹۸۹ء
تعداد اشاعت	چھ سو (۶۰۰)
مطبع	ندائے حق پریس حضرت گنج لکھ
قیمت	گیارہ روپے پچاس پیسے ۱۱/۵۰

ملنے کا پتہ

اردو سماج

۷۵۔ ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ

لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

۱۱- لکھنؤ سے دریاباد تک ۱۱۱

۱۲- اردو تذکرے اور خواتین ۱۲۳

۱۳- کرشن چندر - اردو کا نڈر سپاہی ۱۳۱

۱۴- مجاز — ایک رومانی افسانہ ۱۳۷

۱۵- اردو میں ریڈرشپ کا مسئلہ ۱۵۳

۱۶- کہانی کی کہانی ۱۵۷

۱۷- ایاز اور ایاز مند ۱۶۵

(دوسرا حصّہ)

۱۸- عربی زبان کا مطالعہ ضروری ۱۷۳

۱۹- تمدّن ایران کا جائزہ ۱۷۷

۲۰- ہند ایران روابط ۲۰۵

۲۱ جواہرات سلطنتی ایران ۲۱۳

۲۲- تاریخ آزادیٔ ہند ۲۳۱

۲۳ ہندوستان کا اوّلین "ملک الشعراء" ۲۴۴

ان سب اعزازات و اعترافات سے زیادہ وزنی اور دائمی ان کی شہرت ہے جو کم ادیبوں اور شاعروں کو اپنی زندگی میں نصیب ہوتی ہے مسعود صاحب کو اردو دنیا میں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی جو شاذ و نادر ہی کسی کے حصّے میں آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو ادب پر تادیر ان کا سایہ قائم نہ رہ سکا۔ ورنہ۔ موجودہ علم و ادب کو ان کی ذات سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں انھیں مزید وسعت نصیب ہوتی۔

ایک ادبی ورکشاپ

(مسعود حسن رضوی)

سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام ذہن میں آتے ہی زبان کچھ ٹھٹک سی جاتی ہے، اور اچھے خاصے آدمی کی قوت گویائی خود بخود متاثر ہونے لگتی ہے۔ در اصل یہ مسعود صاحب کے نام کا کوئی ہوّا نہیں ہے بلکہ ان کی اصلاح زبان کی اس کوشش کا نتیجہ ہے جو ان کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہتی تھی اور جس کی مدد سے وہ اپنے مخاطب کے لسانی و صوتی اغلاط کو اتنی خوبی سے نمایاں کر دیتے تھے کہ اس کی معقول اصلاح بھی ہو جائے اور کسی کو ناگوار خاطر بھی نہ ہو۔

ساری عمر تحقیق و تصنیف کے کام میں مصروف و منہمک رہنے کی وجہ سے "اصلاح زبان و بیان" کا شغل ان کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا۔ غالباً ان کی سب سے زیادہ محبوب "ہابی" بھی یہی تھی۔ روزمرّہ بات چیت میں خاصے پڑھے لکھے لوگ آزادی اور بے باکی سے غلط اور مہمل الفاظ و محاورات کا استعمال کرتے رہتے ہیں مسعود صاحب کے سامنے ایسے حضرات گنگ اور بے زبان ہو کر رہ جاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے موقع پر مذکورہ لوگ شرمندہ یا خجل ہونے کے بجائے متفخّر اور مسرور ہوتے تھے کہ لکھنؤ میں ابھی ایک ایسی شمع فروزاں ہے جس کے دم سے اردو زبان و ادب کی دنیا میں اجالا ہے اور لفظوں کو تراش خراش کر حسین بنانے کا عمل جس کی ابتدا ناسخ نے لکھنؤ میں کی تھی وہ آج بھی اسی ایک "شخص نما ادارہ" کی ذات سے جاری و ساری ہے۔ لیکن بقول شاعر ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے ——— جانے والوں کی یاد آتی ہے

مسعود صاحب جامع الشخصیات تھے۔ ان کی علمی اور ادبی شخصیت سے قطع نظر کر کے اگر ان کی ہشت پہل زندگی کے اس معمولی سے گوشے پر نظر ڈالی جائے جو اصلاح زبان کی کوششوں سے متعلق ہے تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ ایک ایسی شخصیت کے بھی مالک ہیں جو نہایت مرنجامرنج اور بذلہ سنج طبیعت کے ساتھ اصلاح زبان و بیان کے کام میں ہمہ روز اور ہمہ وقت یوں مشغول ہے جیسے یہ ایک ذات یا شخصیت نہیں بلکہ کوئی بہت بڑا ادبی ورکشاپ ہو جہاں مختلف الفاظ تحقیق و تفتیش اور تراش خراش کی منزلوں سے گزرنے کے بعد حسین و جمیل، دلکش اور دیدہ زیب پیراہن میں ملبوس ہو کر اپنی اصلیت اور صحت کا بذات خود اعلان کرتے ہوئے نظر آرہے ہوں۔

مسعود صاحب کو فقرے چست کرنے اور اپنے مخاطب کو زچ کر لینے کا فن خوب آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں کو وہ اپنی عام بول چال کی زبان میں بھی استعمال کرتے تھے اور تحریر میں بھی ان کی یہی خوبی سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے کہ اپنی بے انتہا علمیت اور قابلیت کے باوجود زبان کی سادگی اور سلاست کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ حاضر جوابی کا یہ عالم کہ اگر کسی نے ان کو تپاک سے سلام عرض کرنے کے بعد انکساری اور روانی کے ساتھ پوچھ لیا "حضرت۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں۔؟" مسعود صاحب برجستہ جواب دیتے تھے "بھئی میرا صرف ایک مزاج ہے۔ کئی ایک نہیں ہیں۔" یقیناً یہ ان کی قدآور شخصیت کا تاثر تھا جس کی وجہ سے ان کا مخاطب نادم اور لاجواب ہو جاتا تھا۔ ورنہ بڑے ادب سے جواب دیا جا سکتا تھا کہ ایک شخصیت کا ایک ہی مزاج ہوتا ہے، لیکن آپ تو جامع الشخصیات ہیں۔ جب آپ کی شخصیتیں کئی ہیں تو مزاج بھی کئی ہونا چاہئیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک لحیم شحیم شاعر کانپور سے لکھنؤ تشریف لائے تھے

اور مسعود صاحب کے کمرے میں کافی دیر سے بیٹھے ہوئے مشاعروں اور رسائل میں اپنی ادبی اہمیت اور عظمت کے موضوع پر تال ٹھونک کر بڑے فخریہ انداز میں تقریر فرما رہے تھے اور بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ طول گفتگو کی وجہ سے مسعود صاحب ان سے بیزار ہو چکے تھے۔ لیکن شاعر صاحب بڑی روانی سے تقریر کر رہے تھے۔ حادثہ یہ ہوا کہ ایک بار بیچارے شاعر صاحب کی زبان پھسلی تو ان کے منہ سے بیساختہ یہ جملہ ادا ہو گیا۔ "یہ تو الفاظوں کا پھیر ہے" مسعود صاحب سے نہ رہا گیا اور انھوں نے شاعر صاحب کو بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ "آپ تو خاصے پہلوانِ سخن ہیں، آپ کو کس کا ڈر ہے۔ الفاظوں نہیں بلکہ الفاظاتوں کہئے تو ایک بات بھی ہے" شاعر صاحب پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا اور چار و ناچار خاموش ہو رہے اور پھر اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

صاحب موصوف نے ایک دن راقم الحروف کو بتایا کہ "جب تم مجھ سے ملاقات کر کے چلے جاتے ہو تو میں تمہارے اغلاط درج کرتا ہوں" یہ سن کر میں خاصہ حیران ہوا۔ نتیجتاً جب دوبارہ ایک ضروری ملاقات کے لئے گیا تو لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی مسعود صاحب نے بڑے اطمینان سے پوچھا "کہو خاموش کیوں ہو، کچھ طبیعت ناساز تو نہیں ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ میں زبان کا ایک ابتدائی اور معمولی طالب علم ہوں، ظاہر ہے جب اظہارِ خیال کی جسارت کروں گا تو اس میں اغلاط بھی ہوں گے، اس لئے میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے اغلاط درج کرنے کی بیہودہ زحمت اٹھانا پڑے۔ اس جواب سے صاحب موصوف بہت محظوظ ہوئے اور کہا کہ "ارے بھئی یہ تمہارے لئے کسر یا ہتک کی بات نہیں بلکہ تمہیں فخر ہونا چاہئے کہ جن صفحات پر مولانا حسرت موہانی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، جوش ملیح آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی اور نوح ناروی جیسے اساتذہ کے اغلاط درج کئے گئے ہیں وہاں تمہارا نام بھی موجود ہے۔ مجھے

موصوف کے اس انکشاف سے حیرت اور استعجاب کے ساتھ فخر اور انبساط بھی محسوس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان سے ہر ملاقات میں کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ میری ہی طرح کے نہ جانے کتنے طلبا، اساتذہ اور صاحب قلم مسعود صاحب کی ذہانت، ذکاوت اور جذبۂ اصلاح زبان وبیان سے ایک طویل عرصے تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔

روزمرّہ کی گفتگو کے سلسلہ میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ جس محفل میں موجود ہوتے اس پر چھا جاتے اور ہمیشہ جان محفل بنے رہتے۔ جب مرحوم موصوف یوں تو عرصۂ دراز سے سبکدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سخت علالت کے باوجود اس دوران بھی تصنیف وتالیف کا کام انجام دیتے رہے اور سوتے جاگتے بھی اپنے فرائض پر سختی سے کاربند رہے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ادبستان میں اتنا مواد موجود ہے کہ جسے اگر ترتیب دیا جائے تو بلا مبالغہ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کی تقریباً دوسو ڈگریاں حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن اس کے لئے کئی عمریں درکار ہوں گی۔ انھوں نے آخر میں قطعی گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور کسی ادبی یا سماجی تقریب میں مشکل سے شریک ہوتے تھے۔ موصوف کو مشاعروں کی صدارت اور کسی شاعر کے مجموعۂ کلام پر "پیش لفظ" یا "مقدمہ" لکھنے سے نفرت کی حد تک گریز تھا۔

ان کا ایک مضمون تین چار ماہ کے عرصہ میں اگر پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے تو، حیرت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے مضمون کی تیاری سے پہلے ان میں شامل لفظوں کی نوک پلک، محاوروں اور جملوں کی نشست وبرخاست نیز مفاہیم ومعانی کی اہمیت اور افادیت کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے مسعود صاحب اسے کافی عرصہ تک اپنی "تجزیہ گاہ" (LABORATORY)[۳] میں تنقید وتحقیق کی کسوٹی پر آزمایا کرتے تھے، اپنے مضمون کی ہر قسم کی جانچ اور پرکھ کے بعد وہ اسے اشاعت کے لئے جاری کرتے، ان کے کسی مضمون کا اجرا بالکل اسی طرح ہوتا تھا جیسے کسی کارخانے سے

کوئی نئی چیز بن کر نکلتی ہے تو اجرا سے پہلے اسے اچھی طرح سے ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جاتا ہے۔ مسعود صاحب اس تخلیق بعد تحقیق کے اس قدر قائل تھے کہ بسا اوقات تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً غالب کا کوئی ایسا مشہور اور عام فہم شعر لے لیجئے جو زبان زد عوام ہو اور ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو، لیکن مسعود صاحب کو اگر اسی شعر کو اقتباس یا مثال کے طور پر پیش کرنا ہے تو وہ دیوان غالب کے جتنے معتبر اور مستند ایڈیشن ان کے پاس موجود ہوں گے پہلے ان میں درج اس شعر کا موازنہ کریں گے پھر اس کو اپنے قلم سے درج کریں گے۔ اس کام کو انجام دینے میں خواہ کتنا ہی وقت صرف ہو جائے وہ جب تک مختلف حوالوں کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو مطمئن نہ کر لیں گے اپنی تحریر تو الگ رہی کسی حوالہ کو بھی پیش نہ کریں گے۔ لہٰذا صاحب موصوف کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ انھوں نے جس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اسے انجام تک پہونچایا اور ایک خالق، ناقد یا محقق کی حیثیت سے اپنا حق ادا کر دیا۔

حالانکہ مسعود صاحب کی مادّی شخصیت اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے لیکن ان کے اقوال، اصلاحیں اور کارنامے رہتی دنیا تک علم و ادب کی منزل میں اہم سنگ میل کی حیثیت کے حامل ہیں جن کی ضو سے فن و تخلیق کے قمقمے ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

لکھنؤ سے دریاباد تک

(مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر آخرت)

۶؍ جنوری ۱۹۷۷ء کی تاریخ ذہن میں پتھر کے نقوش کی طرح کندہ ہے۔ یہ دن اردو ادب کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ ۷؍ جنوری ۱۹۷۷ء کو سوگواروں کا ایک بڑا ہجوم شرفائے اودھ کی تہذیب اور روایتی وضعداری کا جنازہ اپنے کاندھوں پر لاد کر لے گیا تھا۔ اعزا، احباب اور ہمدردوں کی نمناک آنکھیں نیز متاثرین کے دھواں دھواں چہرے زبان بے زبانی سے رنج والم کی ایک ایسی کربناک داستان دہرا رہے تھے جس کا ذکر کرتے ہوئے قلم تھرتھرا جاتا ہے۔ اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

۶؍ جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے سفر آخرت اختیار کیا تھا بظاہر تو یہ "طویل سفر" لکھنؤ سے دریاباد تک تھا، جس میں سارا دن تمام ہوا۔ لیکن دراصل یہ ایک سانس کا سفر تھا جس نے مولانا کے موصوف کو اپنے رب حقیقی سے ملا دیا تھا۔ ان کی زندگی کے کوائف اور حالات سمجھنے کے لئے زیر نظر شعر سمجھنا از بس ضروری ہے ؎

اتحاد یست میان من و تو   من و تو نیست میان من و تو

مذکورہ بالا شعر کا سب سے قرین قیاس اور قابل قبول مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ عشق میں چند لمحوں یا ثانیوں کے لئے ایک ایسا نادر اور انمول موقع ہاتھ آتا ہے

جب دو علیحدہ علیحدہ جسم اور وجود ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ ایک جان دو قالب کی بھی یہی دلیل ہے اور اسی منزل پر پہونچنے کے بعد "انا الحق" اور "ہمہ اوست" کی صدائیں بازگشت کرتی ہیں۔ عشق میں ایسے اتحاد کی مثال اور کہیں نہیں ملتی کہ "من و تو" کا وجود پارہ پارہ ہو جائے۔ اور قطرے یہم ہو کر سمندر کی شکل اختیار کر لیں عبد کا اپنے معبود سے جاملنا، خلق کا خالق حقیقی سے ملنے کے بعد لاوجود ہو جانا، بشر کا کائنات میں جذب ہونا اور عاشق کا محبوب کی ذات میں ضم ہو کر "من و تو" کی سرحدیں توڑ دینا عشق کی اسی منزل کی مختلف مثالیں ہیں۔ مشہور صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطارؒ نے بھی تقریباً یہی خیال اپنے ایک شعر میں پیش کیا ہے وہ عاشق کے معشوق سے بچھڑنے اور دوبارہ مل جانے کے "تقاضائے عشق" کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

> جب کوئی مچھلی پانی سے باہر کر دی جاتی ہے تو وہ بے چین ہو کر ادھر اُدھر تڑپنے لگتی ہے، صرف اس امید موہوم پر کہ پھر پانی سے جا ملے۔ اسی طرح اپنے محبوب سے جدا روح ایک مرکز خیال کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے، کہ پھر وہ اپنے محبوب سے جا ملے اور پھر جب وہ اپنے محبوب سے جا ملتی ہے تو وہ روحانی مسرت اور خود سپردگی کی کیفیت سے مغلوب ہو کر اپنے آپ میں کھو جاتی ہے، اس کے دل پر پھر کسی اور شے کی چاہت کا غلبہ نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ جنت بھی اس کی نظر میں بے وقعت اور غیر جاذب بن کر رہ جاتی ہے۔"

لہٰذا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "عشق" میں "اتحاد" کی یہی وہ منزل ہے جہاں من و تو کا وجود عشق کی راہ میں دیوار بن جاتا ہے۔ اور جب

پہلا حصّہ

عاشق اور معشوق کی ذاتوں میں کشف، جذب، عرفان اور وجدان کی طاقتیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ تو درمیان سے یہ دیوار تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح "من و تو" کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور صرف ایک ذات کا وجود باقی رہ جاتا ہے۔ جسے اقبال کی زبان میں "فنا فی اللہ" اور "ہمہ اوست" کا درجہ حاصل ہے۔

مولانا کی حیات پر اس سے زیادہ مفصل اور مکمل تبصرہ ایک امر محال ہے اور اس کے وسیع ترین ذہنی رجحانات کا محاسبہ کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے۔ وہ اوائل عمری میں اپنے محبوب حقیقی سے غائبانہ طور پر متعارف ہوئے۔ جوانی میں اس کے وجود سے منحرف ہو گئے اور اس کے بعد اسے اور اس کے احکام کو ایسا گلے لگایا کہ انتقال کے پہلے "جائے نزع" خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ ان کے بہکانے میں اگر مغرب کے چند گمراہ فلسفیوں کا ہاتھ تھا تو صراط مستقیم پر لانے کے لئے مولانا محمد علی جوہر، مہدی افادی اور اکبر الہ آبادی جیسے "نیکی کے فرشتوں" کا نزول بھی شائد روئے زمین پر انھیں کے لئے ہوا تھا۔ ایک گمراہ عالم کو راہ راست پر لانے کا مطلب پوری قوم کو سدھار لینے کا ہے اور اس عظیم کام کو ان دونوں "مسٹر ملاؤں" نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اکبر "چیت مارتے" تھے، اور مولانا جوہر "سہلاتے" تھے۔ آخر کو یہی تکنیک عبدالماجد فلسفی بی۔ اے کو "مولانا عبدالماجد دریابادی" یا "مولانا دریابادی" بنانے میں کارگر ثابت ہوئی۔ ان کا وجود صرف اس لئے "مذہبی" اور "مقدس" بن گیا تھا کہ وہ "دائرۂ الحاد" کی حدوں کو توڑ کر دوبارہ "حلقۂ اسلام" میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی عقل اور فکر پر پڑے ہوئے مغربیت کے دبیز پردوں پر فہم، ادراک، عرفان، خود آگہی" دوبارہ غالب آگئی تھی اور "منتشر مزاجی" کی جگہ مستقل مزاجی نے لے لی تھی۔ وہ ایک زمانے میں "نشاط آور" اور نشاط انگیز" مشہور تھے لیکن تشکیک کے پردے جب سے چاک ہوئے وہ صرف ایک "صوفی صافی"

ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ معنی قطعی نہ اخذ کئے جائیں کہ وہ "زاہد خشک" تھے۔ اور صرف وعظ و پند میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس کے برعکس ان کی ذہنی کیفیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ صحیح معنوں میں "جامع الحیثیات" "جامع الشخصیات" بلکہ ایک "عجیب الخلقت" شخصیت و کردار کے مالک تھے۔

مولانا نے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے فلسفہ کے مضمون کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا اور مصروفِ مطالعہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں مائل بہ الحاد ہوئے اور اس کا سلسلہ آٹھ دس برس تک چلتا رہا۔ علی جواد زیدی کے بقول:۔

"۱۹۱۸ء میں بدھ مذہب اور ہندو فلسفہ کی طرف علی العموم اور تھیاسوفی کی طرف علی الخصوص توجہ مبذول ہوئی۔ مسز اینی بیسنٹ، اروند گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراج تلک اور ایڈمنڈ ہومز کی تصنیفات نے مادیت اور الحاد کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ صبح کا بھولا شام کو پھر روحانیت کے آستاں پر آیا۔ پھر شبلی نعمانی کی "سیرت النبی" اور مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن پڑھنے کو مل گیا۔ اور مولانا اپنے قول کے بموجب "از سر نو مسلمان" ہوئے۔"

مولانا محمد علی جوہر، مہدی افادی اور اکبر الہ آبادی کی کاوشیں بھی جاری رہیں۔ مہدی افادی پانی چڑھاتے رہے اور اکبر نے امیدوں کے قصیدے باندھے ؎

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت
دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ

ان حضرات کی کاوشوں کا بڑا اثر ہوا اور علی جواد زیدی کے مطابق:۔

"۱۹۲۰ء کے آس پاس مسٹر عبد الماجد، مولانا عبد الماجد بننے لگے۔ داڑھی رکھ لی وضع قطع میں مذہبی رنگ نمایاں ہونے لگا، محافل سماع میں شرکت کرنے لگے۔ مزار محبوب الٰہی پر چلہ کشی کی۔ نماز اور روزے کے علاوہ اور

بھی روحانی مشقیں کیں۔ مذہبی کتب سے شغف بڑھایا اور سنہ ۱۹۳۲ء سے قرآن مجید کی تفسیر ماجدی بھی، کل کا ملحد آج کا مفسّر ہے۔"

تفسیر ماجدی کے علاوہ مولانا کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ساٹھ تک پہونچتی ہے، انھوں نے تاریخ، ادب، نفسیات، فلسفہ، ترجمہ، تفسیر، تصوف، منطق، سوانح اور سفرنامہ وغیرہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مضامین کی تعداد ان گنت ہے۔ خطبے، دیباچے، مقدمے، حاشیے، تقریظیں، تبصرے، "سچ" "صدق" اور "صدق جدید" کے مستقل کالم ان کے علاوہ ہیں۔

مولانا دریابادی اپنے منفرد طرز تحریر اور یکتائے روزگار اسلوب بیان کے لئے بہت مشہور ہیں۔ اپنے انداز نگارش کی شوخی اور زبان کے چٹخارے کا ذکر کرتے ہوئے خود رقم طراز ہیں۔

"قہقہہ آفرینی نہیں بلکہ ایک انبساطی کیفیت جو بہت پھیلی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی الذ لیس یہ محرک قومی نہیں جو حرارت جسم کو انتعاش میں لے آئے صرف مسکّن جو مسرّت کی ہلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے۔ وصال نہیں صرف خیال وصل بقول شخصے کہ

خیال ہی میں مزے وصل دلربا کے لئے

مولانا نے حیدر آباد کے "دار الترجمہ" میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ دنوں تک "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس"، علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے رفیق کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ لیکن ان کی ذہانت، لیاقت اور خود داری ہمیشہ آڑے آئی۔ ان کی فکر رفعتوں کی تلاش میں رہی اور اپنے ذہنی سفر میں وہ تمام عمر پابہ جولاں رہے۔ اس لئے ملازمت کے تقاضوں سے کبھی پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ در اصل ان کو اپنی منزل معلوم تھی اس لئے وہ راستے کی ہر پیچیدگی اور آلودگی سے اپنا دامن بچاتے رہے اور اپنے مشن کو خاموشی سے

پورا کرتے رہے۔ مولانا اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اپنے کاموں کو بڑی تندہی اور وقت کی پابندی کے ساتھ نپٹاتے تھے۔ "سچ" "صدق" اور "صدق جدید" کے ساتھ ساتھ متعدد مضامین اور تصانیف کا پابندی وقت کے ساتھ اجراء ان کی مذکورہ خصوصیات پر مہر تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا ماجد تمام عمر بے تکان کام کرتے رہے، بقول غالب ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

"رخش عمر" تمام عمر تھما تو نہیں لیکن اس کی رفتار میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ فرق ضرور آتا گیا۔ اور عمر کے تقاضے، تصنیف و تالیف کے مشاغل میں آڑے آنے لگے۔ پیری کے ساتھ ساتھ صحت، طاقت اور ہمت جواب دیتی گئی۔ مختلف عوارض و امراض وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ فالج کے کئی حملے ہوئے خود مولانا نے ۱۰ مئی ۱۹۶۳ء کے "صدق جدید" میں اپنی بیماری کا حال "بیماری کی داستان۔ بیمار کی زبان سے" عنوان کے تحت لکھا ہے جس میں اپنے مرض سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ایک دانشمندانہ جذبہ شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"فالج پر فاضلانہ مقالے خوب مفصل انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مل سکے اور درجہ اوسط میں چیمبرس انسائیکلوپیڈیا اور اختصار کے ساتھ ایوری مینس انسائیکلوپیڈیا میں تھے۔ سب اپنی استعداد و بصیرت کے ساتھ پڑھ لئے بندہ جو تسکین قلب ڈھونڈھتا ہے ظاہر ہے کہ بجز کتاب دل کے اور کہیں بھی نہ مل سکی۔

۵ مارچ کی شب میں جب مرض کا حملہ ناگہاں ہوا تھا تو علاج مقامی ایلوپیتھ ڈاکٹر وجیہہ الدین اشرف نے جن سے برادری کے تعلقات بھی ہیں،

بڑی توجہ سے کیا تھا جس سے مرض کے شدائد میں کمی ہوئی۔ لکھنؤ آنے تک انھیں کا علاج رہا۔"

علاج معالجہ کا سلسلہ اس سے پہلے بھی جاری تھا۔ ہمدرد دواخانے کے مالک حکیم عبدالحمید اور لکھنؤ کے ہومیوپیتھ ڈاکٹر اشتیاق قریشی ان کے خاص معالجین میں تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے دہلی سے دوائیں اور بدن پر مالش کرنے کے لئے روغن زیتون بذریعہ پارسل ارسال فرمائی تھیں اور ڈاکٹر اشتیاق انھیں ہر سنیچر اور اتوار کو لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنے طبّی مشورے اور دوائیں دیتے تھے۔ غرضکہ ان کی صحت روز بروز گرتی گئی اور دوا علاج زندگی کا معمول بن گیا۔ دواؤں کے بغیر مفرّ نہ تھا اور دواؤں کے سہارے ہی زندگی تھی۔

تعجب اور حیرت ہے کہ پیری اور ضعف کے ان ایام میں بھی مولانا نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور "صدق جدید" پابندی وقت کے ساتھ نکالتے رہے۔ البتہ ان کے بھتیجے اور داماد عبدالقوی دریابادی کی ذمہ داریوں میں خاصہ اضافہ ہوگیا تھا۔ قوی صاحب مولانا کے ارشادات کو سلیقے سے قلمبند کر لیتے تھے۔ حق اور صداقت کی زندگی کے ساتھ ساتھ تصنیف کا کام بھی برابر جاری رہا انھیں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سند اعزاز اور تاعمر وظیفہ بھی ملا۔ اور لکھنؤ کی ایک ادبی اور ثقافتی انجمن کی طرف سے سالانہ ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔ اعزازات اور اعترافات کی بالائی منزل پر پہونچنے کے باوجود مولانا اودھ کی تہذیب کے مطابق ایک "پیکر اخلاص اور مجسّم اخلاق" کی حیثیت رکھتے تھے ان کو اپنا کام عزیز تھا جسے وہ تمام عمر ترتیب و تدریج کے لحاظ سے انجام دیتے رہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی عمر کے آخری دنوں میں سماعت اور بصارت سے خاصی حد تک محروم ہو گئے تھے گو کہ وہ اپنے جاننے والوں کو بھی مشکل سے پہچان پاتے تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی اردو زبان کی خدمت کا جذبہ انھیں

اپنے بھتیجوں جناب حبیب قدوائی اور علیم قدوائی کے سہارے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے جلسوں میں شرکت کرنے کے لیے کھینچ کر لاتا تھا۔ اکاڈمی کے دوسرے ارکان اکثر ان کی شرکت پر محوحیرت ہو جاتے تھے۔ یہ سلسلہ مولانا کے صاحب فراش ہونے تک جاری رہا۔ اور اگر ان کے کولہے کی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہوتی تو وہ صاحب فراش ہونے والے کب تھے۔ بستر علالت پر ہی ان پر فالج کا آخری دورہ پڑا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انھوں نے ۵ ر اور ۶ ر جنوری ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب میں اس دنیائے فانی سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا اور اپنے رب حقیقی سے ہمیشہ کے لئے جا ملے ؎

ایسے بھی کچھ اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
ہم ڈھونڈھنے نکلیں گے مگر پا نہ سکیں گے

۶ ر جنوری ۱۹۸۳ء کو سفر آخرت شروع ہوا۔ عینی مشاہدین کا بیان ہے کہ مولانا کی جائے نزع "خاتون منزل" گولہ گنج خوشبو سے مہک رہی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے نیوز بلیٹن اور قومی آواز نے سب سے پہلے انتقال کی خبر جاری کی۔ لوگ خاتون منزل کی طرف چل دئے۔ متعلقین نے مولانا کو نہلا دھلا کر تیار کیا اور انھیں اپنے کاندھوں پر سوار کر کے ندوۃ العلما کی طرف چل دئے "ندوے" کی مسجد میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی نماز جنازہ پڑھائیں گے جنھیں بذریعہ ٹیلی فون اس سانحے کی اطلاع رائے بریلی دے دی گئی ہے۔ اور ایک صاحب اپنی موٹر لے کر بذات خود مولانا کو لانے کے لئے رائے بریلی صبح نو بجے روانہ ہو چکے تھے۔ ندوے میں میت رکھی ہوئی ہے۔ مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ دن ایک پہر کا سفر طے کر کے دوپہر کی منزل میں داخل ہو چکا ہے۔ علی میاں کا انتظار برقرار ہے۔ مجمع میں سیاسی، سماجی، ادبی، علمی، دینی لسانی اخلاقی تہذیبی میدان کے نمائندوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ برابر آتے جا رہے ہیں۔ اور

مولانا کے انتقال کی خبر لکھنؤ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔ لوگ جوق در جوق ندوہ پہونچ رہے ہیں۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر "ندوہ" گراؤنڈ پر نماز جنازہ کے انتظار میں محو ہے۔ ہر شخص ایک سوالیہ نشان بنا ہوا کھڑا ہے لوگ ایک دوسرے سے ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا پوچھ لینا چاہتے ہیں لیکن اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں کسی کے منہ سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل رہا ہے کہ " مولانا علی میاں کب تک آئیں گے "

مولانا کے آتے ہی نماز ظہر کے بعد نماز جنازہ کا اعلان ہوا اور لوگ صفیں درست کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کئی ہزار لوگوں نے مولانا علی میاں کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی اور میت ایک لاش گاڑی پر دریاباد روانہ ہوئی۔ مولانا علی میاں اور دوسرے اکابر نے گومتی کے پل تک پاپیادہ چل کر شرعی اور دنیاوی رسوم ادا کیں اور بس نما لاش گاڑی دریاباد کے لئے روانہ ہو گئی۔ بس میں ان کے اعزا اور خاندان کے افراد ہی سوار ہو سکے۔ بقیہ لوگ اپنے اپنے ذاتی ذرائع سے دریاباد روانہ ہو گئے۔

فضائیں " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ " کی صداؤں سے معمور ہوئیں اور فرشتوں نے درود و سلام سے مولانا دریابادی کی روح کو ایصال ثواب پہونچایا۔ سارا ماحول غمگین اور غمزدہ ہونے کے باوجود ان کی بخشش، مغفرت اور تسکین روح کے لئے دعاگو ہے۔ انھیں زندگی میں سکون قلب" حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اب " تسکین روح " کی دعائیں حق بجانب تھیں۔

بارہ بنکی میں منتظر مجمع " جلوس آخرت " کے ساتھ ہولیا اور شام کو دریاباد پہونچتے پہونچتے ان گنت لوگوں کا مجمع شریک میت تھا۔ آبائی قبرستان میں داخلے کا دروازہ اتنے بڑے ہجوم کی موجودگی کی تاب لانے سے قاصر تھا۔ اس لئے قبرستان کے احاطہ کی ایک دیوار مسمار کر دی گئی تاکہ لوگ ان کے آخری مراسم کو اپنی غمناک

آنکھوں سے دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دے سکیں۔ مغرب کے وقت دوبارہ نماز جنازہ پڑھاکر اس "فرشتہ خصلت" صوفی صافی کو دریاباد کی سوندھی مٹی کی نذر کر دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے مٹی دی اور شریک فاتحہ ہوئے۔

۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء کی تاریخ ذہن میں پتھر کے نقوش کی طرح کندہ ہے یہ دن اردو ادب کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء کو سوگواروں کا ایک بڑا ہجوم شرفائے اودھ کی تہذیب اور روایتی وضعداری کا جنازہ اپنے کاندھوں پر لاد کر لے گیا تھا۔ اعزا، احباب اور متعلقین کی نمناک آنکھیں اور ہمدردوں نیز متاثرین کے دھواں دھواں چہرے زبان بے زبانی سے رنج والم کی ایک ایسی کربناک داستان دہرا رہے تھے جس کا ذکر کرتے ہوئے قلم تھرتھرا جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

اردو تذکرے اور خواتین

قدیم ادب و ادباء کا جدید نسل سے تعارف کرانے میں تذکروں نے جو مثبت رول ادا کیا ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا - اردو ادب کے ابتدائی حالات آج ہم تک اتنے وثوق کے ساتھ نہ پہونچے ہوتے اور نہ ماضی کے ان ہزاروں لاکھوں فنکاروں کی حیات اور ان کے کارناموں کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم ہوتا اگر تذکروں کے ذریعہ ہر دور کی تاریخی تدوین مرتب نہ کر لی گئی ہوتی۔ شعرائے متقدمین سے زمانۂ حال کا رشتہ جوڑنے میں تذکروں نے ایک آہنی زنجیر کا کام کیا ہے۔ اردو میں تذکرہ نویسی کا اثر یوں تو براہ راست فارسی سے آیا اور اردو شعراء کے تقریباً تمام معتبر تذکرے فارسی زبان ہی میں لکھے گئے لیکن اس کے باوجود اردو ادب اور ادباء کے کئی ادوار کے بارے میں اہم ترین معلومات ہمیں انھیں تذکروں کے ذریعہ موصول ہوئیں جو اردو زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔

ان تذکروں کی اہمیت اور افادیت سے اس لئے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ ماضی کے دریچوں کو کھول کر ان کا جائزہ لینے اور قدیم حالات کے چہرے پر پڑی ہوئی گرد آلود نقاب الٹنے کا اور کوئی معتبر ذریعہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخ کی کتابیں اس سلسلہ میں تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہیں، لیکن ان کی مدد سے صرف تاریخی اور سیاسی حالات کا راز افشا ہو سکتا ہے، فن اور فنکاری کی تفصیلات کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اردو ادب میں جو تذکرے لکھے گئے وہ تاریخی اہمیت سے قطع نظر اپنی ترتیب

قومی یکجہتی اور کلام خسرو

وتدوین کے لحاظ سے توسراہے گئے لیکن یہ الزام بھی بار بار لگایا گیا کہ ان میں تنقید کی کمی ہے، جب تک کسی شاعر کے کلام پر نقد و تبصرہ نہ کیا جائے اس وقت تک اس کے کلام کی کوئی دائمی حیثیت نہیں بن سکتی اور نہ اپنے دوسرے ہمعصر شعراء کی درجہ بندی کے وقت اس کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ ایک ناقد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تذکروں میں تنقید کی کمی نہیں ہے، بلکہ تذکرہ نویسوں میں حاسۂ انتقاد یا تنقیدی شعور کی کمی ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ تذکروں میں تنقیدی عناصر کا فقدان ہے یا نہیں ہے بلکہ تذکروں کی تاریخی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ "نکات الشعراء" (میر تقی میر) "شعرائے ہندی" (میر حسن) "گلشن بے خار" (شیفتہ) اور "طبقات الشعراء" (مصنفہ کریم الدین) وغیرہ تذکرے اس عیب سے پاک نظر آتے ہیں لیکن ان تمام تذکروں میں صنف نازک کی نمائندگی کا خاطر خواہ خیال نہیں رکھا گیا ہے اور بعض تذکرہ نویسوں نے اپنے دور کی قابل قدر شاعرات کو نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ ان کے نظر انداز کر دینے سے نہ تو ان شاعرات کی شاعرانہ اہمیت میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہی تذکرے یا تذکرہ نویس پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسے تذکرہ نویسوں پر چشم پوشی اور جانبداری کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ صنف نازک نے ہر دور میں اپنے ہاتھ ستھرے اور نپے تلے انداز میں اردو شاعری کے دامن کو وسعت دینے کی بھرپور جدوجہد کی ہے، کوئی دور شاعرات کی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں اور ان کے فنکارانہ کمالات سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ادب کی قدیم اور جدید عمارتوں میں خلوص دل سے روز افزوں اضافہ کرنے اور ان میں شب و روز نئے نئے رنگ بھرنے والی خواتین کے ادبی کارنامے تو جابجا اردو ادب میں بکھرے پڑے ہیں لیکن ان پر نقد و

تبصرہ کی شدید قلت ہے، حالانکہ ایسی نمایاں شخصیتوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک نہ ہونا چاہئے تھا۔ تذکرہ نویسوں کو ایسی خواتین کی حیات اور ان کے کارناموں کا ذکر اپنے تذکروں میں کرنا چاہئے تھا، لیکن تقریباً تمام اردو تذکرے ایسی نامور اور باکمال ہستیوں سے یکسر خالی ہیں۔ صرف دو تین تذکروں میں چند بہت ہی مشہور شاعرات کے سرسری حالات زندگی اور دو چار شعر انتخاب کے طور پر مل جاتے ہیں، لیکن ان کو دیکھ کر ذہن کی تشفی قطعی نہیں ہوتی بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ صرف فرض کی ادائیگی کے طور پر چند نمایاں اور معزز شاعرات کے حالات اور ان کا مختصر انتخاب شامل ذکر کر لیا گیا ہے، مذکورہ تذکروں کی اگر درجہ بندی کی جائے تو ان کی تعداد بھی انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔ "تذکرہ سراپائے سخن" "تذکرہ مراۃ الخیال"، "تذکرہ چمن انداز" "تذکرۃ الشاعرات" اور "خزانۂ عامرہ" وغیرہ اس ضمن میں سرفہرست اور نمایاں ہیں، ان کے علاوہ دوسرے تذکرہ نگار اس سلسلہ میں بالکل خاموش اور بے نیاز ہیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں اردو فارسی شاعرات کا ایک قلمی تذکرہ "گلشن بے خزاں" کے نام سے موجود ہے جس پر اس کے مصنف کا نام اور سن تحریر درج نہیں ہے۔ دراصل یہ کوئی مکمل تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے اور اس میں جملہ شاعرات کا ذکر تقریباً انھیں الفاظ میں موجود ہے جیسا کہ تذکرہ "مراۃ الخیال"، "تذکرہ سراپائے سخن" "تذکرہ چمن انداز" "تذکرۃ الشاعرات" اور "خزانۂ عامرہ" وغیرہ میں علیحدہ علیحدہ مندرج ہے اس رسالے کے بارے میں یہ قیاس اغلب ہے کہ یہ کسی ایسے صاحب ذوق کی یادگار ہے جس نے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے مذکورہ بالا تمام تذکروں سے نامور اور باکمال شاعرات کے سلسلہ میں معلومات نقل کر کے یکجا کر دی ہیں۔ ایک اور تذکرہ مولانا عبدالباری آسی کا مرتب کیا ہوا "تذکرہ خواتین" کے نام سے مشہور ہے۔ مذکورہ

تذکرہ پچاس ساٹھ برس پہلے ایک بار مطبع نولکشور سے شائع بھی ہوا تھا لیکن اب اس کی کوئی جلد کہیں آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تذکرہ مذکورہ بالا تذکروں سے بالکل اسی طرح ماخوذ ہے جس طرح کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ تذکرہ "گلشن بے خزاں"۔ لیکن اس کے باوجود معرض ذکر تذکرہ میں مولانا آسی کا نام مرتب یا مولف کے بجائے مصنف کی حیثیت سے درج ہے ہر چند یہ مولانا کی تصنیف تو نہیں ہے، لیکن انھوں نے متعلقہ تذکروں کے اقتباس کو ترجمہ کرکے یا تخلیص کرکے جس طرح اپنے خاص بے تکلف انداز میں بیان کیا ہے وہ انھیں کا خاصہ ہے، انھوں نے اپنی زبان دانی کے ذریعہ متذکرہ شاعرات کی جس قابلیت اور دور اندیشی سے درجہ بندی کی ہے اس کے لئے ان کا اعتراف ضروری ہے۔

مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سماج کے پست طبقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کا ذکر جب سخنور کے طور پر کیا ہے تو انھیں بھی اسی اہتمام اور احترام کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے جس طرح باعزت اور اعلیٰ خاندان کی عفت مآب خواتین کا ذکر ان کے تذکرے میں شامل ہے۔ لہذا ان کے اس اہتمام سے ناظرین کو یہ فائدہ ضرور پہونچے گا کہ ان کی نظر میں فنکار اور اس کے فن کی سچی تصویر کھنچ جائے گی۔ اس تذکرے کو پڑھتے وقت یہ بات ان کے پیش نظر رہے گی کہ "کیا بات کہی گئی ہے"! انھیں اس سے کوئی غرض نہ رہے گی کہ اصلاً بات کس نے کہی ہے"، اس غیر جانبدارانہ ترتیب کا اثر ناظرین کے ذہن پر اگر یہی مرتب ہو کہ کس شاعرہ کا ذکر ہے اور اس کا کلام کس پایہ کا ہے تو مولانا کی کوشش کامیاب قرار پائے گی، اس لئے کہ درحقیقت ہمیں فنکار کے فن سے تعلق ہے اس کے خاندانی حالات اور ذاتیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مولانا آسی کی اس تالیف یا تصنیف کے بعد ہمیں کوئی

دوسرا تذکرہ شاعرات یا خواتین قلم کاروں کے سلسلہ میں دیکھنے کو نہیں ملتا ۔ گویا کہ ماضی بعید سے ماضی قریب تک جو روایت ایک مفروضہ کے طور پر اردو ادب میں داخل تھی اب زمانہ حال اس سے بھی محروم ہو کر رہ گیا ہے ۔ اور موجودہ دور میں ایسا کوئی باقاعدہ تذکرہ یا رسالہ منظر عام پر نہیں آیا جس کے ذریعہ خواتین اہل قلم کی ادبی کاوشوں اور فنی جگر کاویوں کے بارے میں تفصیلی نہ سہی مختصر ہی معلومات منظر عام پر آسکیں ۔

موجودہ دور میں خواتین قلم کاروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے بیسویں صدی کے اس سائنسی اور ایٹمی دور میں چند ایسی خواتین "شمشیر قلم" لے کر میدان ادب میں آگئی ہیں جو پہلے "زینت خانہ" تھیں لیکن حالات اور واقعات نے انھیں اب "چراغ محفل" بنا دیا ہے، جنھیں زبان قلم سے حکایت غم دوراں اور گردش روزگار بیان کرنے میں مہارت تامہ حاصل ہے ۔ روز افزوں ترقی کے مدارج طے کرنے والی آج کی دنیا کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور کوائف زمانہ کا حل تلاش کرنے میں ان کی فکر رسا صنف تضاد سے کسی میدان میں پیچھے نہیں ہے جدید ہندوستان کی کسی بھی ادیب، شاعرہ، ناقد، افسانہ نگار یا مضمون نگار خاتون کی تحریروں اور خیالات و جذبات کا اگر عمیق مطالعہ کیا جائے تو اس کے یہاں یہی پیغام ملے گا ؎

تقلید غیر راہ محبت میں ننگ ہے
آگے ہی بڑھ کے چلتے رہے کارواں سے ہم

عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، حمیدہ سلطان، سلمیٰ صدیقی، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، سیدہ جعفر، عفت بانو زیبا، ساجدہ زیدی، کوثر جہاں کوثر، شکیلہ اختر، ذکیہ سلطانہ، رقیہ منظور الامین، شفیق فاطمہ، عطیہ پروین، ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، شفیقہ فرحت، واجدہ تبسم، عفت زریں، حسنیٰ سرور، مظفر النساء، عابدہ احمد،

کاظمی بانو ضیا، طیبہ سہیل، مسعودہ حیات، رباب جعفری اور شمیم نکہت وغیرہ اس درجہ کی قلم کار ہیں جنھیں اپنی بات کہنے کا طریقہ آتا ہے۔ اور دوسروں سے اسے منوانے کی اہلیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر کوئی خاتون قلم کار اسی سمت خصوصی توجہ دے تو زیادہ بہتر ہے۔ عہد حاضر کی تمام ادیب اور شاعرات کا تذکرہ ترتیب دے کر یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ جس میں جانفشانی اور مستقل مزاجی ضرور درکار ہے لیکن اس قسم کا کام تو وقت کے اہم تقاضوں کی تکمیل میں مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

کرشن چندر

اردو کا نڈر سپاہی

کرشن چندر - افسانہ نگار، ناول نگار، طنز نگار، خاکہ نگار، انشاء پرداز اور نہ جانے کن کن حیثیتوں سے تقریباً چالیس سال تک آسمان ادب پر ایک درخشندہ اور روشن ستارے کی طرح جھلملاتے رہے۔ یہ ان کی ذات کا جادو اور جذبہ کی صداقت کا اثر تھا کہ وہ ہر دور میں اپنے حریفوں یا خوشہ چینوں کے نرغے میں آئے لیکن ہمیشہ ان کے نظریے کو اپنے مخالفین کے نظریات پر سبقت اور اولیت حاصل ہوئی۔ یہی ان کی کامیابی انفرادیت اور یکتائے روزگار ہونے کی دلیل ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو کوئی دور چوٹی کے فنکاروں سے خالی نہ ملے گا۔ کرشن چند کا نام بھی بیسویں صدی کے عظیم فنکاروں میں شامل ہے۔ اور اردو افسانے کی تاریخ میں انھیں پریم چند کے بعد دوسرا بڑا درجہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جو چیز انھیں اردو افسانہ نگار سے زیادہ ایک "اردو داں" "محب اُردو" "پرستار اُردو" "شیدائی اُردو اور "خادم اردو" کی حیثیت سے اپنے عصر کے تمام ممتاز قلم کاروں میں نمایاں اور سرفہرست قرار دیتا ہے، وہ ہے ان کی اردو دوستی۔ وہ اپنی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے برابر ہر میدان میں لڑتے رہے، نہایت دیانتداری، سچائی اور صدق دل کے ساتھ۔ اسی لئے انھیں اردو کا ایک نڈر سپاہی کہنا غلط نہ ہوگا۔ کرشن چند کے افسانوں اور ناولوں کی ہندی میں اشاعت گو کہ اُردو سے کہیں زیادہ تھی اور ان سے انھیں خاطر خواہ معاوضہ بھی ملتا تھا۔ لیکن اس کے

باوجود ان کی بھاری بھرکم شخصیت کبھی نشیب کی طرف ڈھلکی نہیں بلکہ آخر وقت تک وہ اردو کا ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے پر فخر کرتے تھے نیز اردو کا ز کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے، وہ سچے اُردو دوست تھے - اپنی زبان کے بارے میں انھوں نے ارباب اقتدار سے کبھی کوئی سودا نہ کیا- یہی وجہ ہے کہ ہم عصر فنکاروں میں انھیں ایک درجۂ امتیاز حاصل ہے - وہ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے ایک بہت بڑے حامی اور وکیل تھے - اور اُردو کے مقدمہ کی پیروی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے - اس سلسلہ میں ان کی ہمّت اور جواں مردی قابل دید تھی اور اب قابل ذکر ہے -

لکھنؤ میں تقریباً دس سال قبل ترقی پسند اُردو مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں اُردو کو دہلی، یو- پی، آندھرا پردیش، راجستھان، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش وغیرہ ریاستوں میں دوسری سرکاری اور علاقائی زبان کا درجہ دیئے جانے کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی - اس کانفرنس میں کرشن چندر کے علاوہ - فراق گورکھپوری، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر سمیت ملک کے تقریباً سب ہی قابل ذکر ادیب اور شاعر شامل تھے - لیکن عجیب اتفاق ہے کہ کانفرنس کے دوسرے روز سیمینار ہندی کے مشہور و معروف ادیب مرحوم یشپال کی صدارت میں ہوا جس میں اُردو کے چند "نادان دوستوں" نے اس تجویز سے اتفاق کیا کہ اگر میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ کو نصابی کتابوں میں شامل کر لیا جائے تو انھیں اُردو کو ناگری رسم خط میں تبدیل کر دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا - اس تجویز کے آتے ہی عجیب ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی اور صدر جلسہ نے بھی اس تجویز کی موافقت کی لیکن ــــ کرشن چندر کی واحد شخصیت تھی جو طوفان باد و حوادث کے مقابلے میں ایک تنکے کی طرح مخالفت میں ڈٹی رہی - انھوں نے نہ صرف اس تجویز کی

سرے سے مخالفت کی بلکہ اسے اُردو کی بیٹھ میں چھرا گھونپنے کی سازش سے تعبیر کیا اور اس طرح وہ دوسرے ہم عصروں، ادیبوں اور قلم کاروں کو خواب خرگوش سے چونکانے میں کامیاب ہوئے۔ کرشن چندر نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حکومت وقت سے کوئی مختانہ یا صلہ نہیں بلکہ اپنی زبان کا حق مانگتے ہیں۔ اور وہ اُردو کو ہندوستان میں اس کا جائز مقام دلا کر رہیں گے۔ دہلی میں ایفرو ایشائی ادیبوں کی کانفرنس کے موقع پر چند موقع پرستوں نے ایک بیان جاری کر دیا کہ وہ اُردو کا موجودہ رسم خط بدل کر ناگری رسم خط کر دینے کے حامی ہیں۔ بیان جن ادیبوں کے دستخط سے جاری ہوا تھا ان میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر نریش اور کرشن چندر کے نام شامل تھے۔ جب ان ادیبوں سے اس بیان کی تصدیق یا تردید کرنے کے لئے کہا گیا تو آخر الذکر کے علاوہ سب ہی نے کسی نہ کسی منزل پر اس سے متعلق ہونے کا دعویٰ کیا۔ صرف کرشن چندر تھے جو یہ خبر اخبارات میں دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے اور عملی طور پر اس بیان سے اپنے عدم اتفاق اور اس تجویز کی عدم تائید کی۔ انھوں نے راقم الحروف کے نام ایک تین صفحہ کے تفصیلی خط میں اُردو کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ تقریباً اسی مضمون کا ایک خط محترم خوشتر گرامی (بیسویں صدی دہلی) کو بھی تحریر کر رہے ہیں تاکہ ان کے جذبات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچ سکیں۔ بعد کو یہ خط یو۔ پی اور دہلی کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوا تھا۔ خط کا اصل متن تو طویل ہے لیکن اس میں زور دے کر یہی بات کہی گئی ہے کہ وہ (کرشن) اُردو کے خلاف کسی سازش میں شریک ہو کر اپنے ضمیر کا خون نہیں کر سکتے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں لکھا تھا کہ آج کرشن چندر کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک

میں بھی وہ مقبول ہے۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنی زبان اور اپنے ملک کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک ادیب جس بنیاد پر دیواریں اٹھا رہا ہے اگر وہ ٹھوس اور مضبوط نہیں ہے تو دیواروں کو استحکام نہیں حاصل ہو سکتا۔

کرشن چندر کے آج بھی اس قول کی صداقت سے ذرہ برابر بھی گریز نہیں کیا جا سکتا کہ کرشن کی بنیاد اتنی مضبوط تھی کہ وہ ادب کی دنیا میں ایک آہنی دیوار کی طرح اپنے ارادوں اور حوصلوں کی سرپرستی کرتے رہے، انھیں جلا بخشتے رہے اور تمام عمر ان کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہے۔

کرشن چندر کے دل میں اردو کے لئے بہت درد تھا۔ ملاقاتوں کے دوران اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ زحمتیں اٹھا کر ایک سخت دور سے گزر گئے لیکن آنے والے دور کے ادیب کو ریڈرشپ کا قحط پنپنے نہ دے گا۔ اس جذبہ کے تحت وہ اپنی زبان کی تبلیغ اور پرچار کے لئے اکثر سخت مصروفیتوں کے باوجود بھی ملک کے دور دراز علاقوں میں منعقد ہونے والی اردو کانفرنسوں، سمیناروں اور دوسرے اجتماعات میں نہ صرف شریک ہوتے بلکہ آزادانہ فضا میں صاف دل کے ساتھ اردو کی حمایت کرتے اور تائید میں تقریر کرتے۔ تجویزیں پیش کرتے اور اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لئے برابر دوسری تدبیریں اختیار کرتے رہتے تھے۔ دوسرے بہت سے ادیبوں کی طرح انھوں نے ادب کو فیشن کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ان کے دردمند دل کے نازک احساسات نے انھیں ادیب بنا دیا تھا۔ اور ان کے قلم کو ایسا شاعرانہ لہجہ عطا کیا تھا جو قاری کے دلوں کو متاثر کرتا تھا اور ان کے داخلی محرکات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔

در چار حد کوی تو افتادہ بینی بندہ را
تن یکطرف، جاں یکطرف، سر یکطرف، پا یکطرف

امیر خسرو دہلوی کی شخصیت اور اُن کے منظوم و منثور شاہکاروں کا اگر بنظر غائر مشاہدہ اور مطالعہ کیا جائے تو محامد و محاسن کی اتنی بڑی تعداد برآمد ہو گی جس کا شمار کرنا اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار گذار ضرور ہو گا۔ ان کی ساری زندگی ایک معجزہ اور کرشمہ تھی۔ وہ جامع الحیثیات تھے۔ ان کے فنی کمالات کے زندۂ جاوید ہونے کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا جا رہا ہے، خسرو اور اُن کے کلام کی قدر و قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ خسرو بیک وقت مرد صوفی، شاعر، ادیب، مصنف، مورخ، موسیقار، داستان گو، قصہ نویس، سپاہی، مصاحب اور بہت سی دیگر خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ نہ صرف مذکورہ بالا حیثیات کے مالک ہی تھے بلکہ ان کو تمام شعبہ جات پر عبور، دسترس اور قدرت کاملہ حاصل تھی۔ خسرو کی نظم و نثر کے نمونے دیکھنے کے بعد ان کی ذہانت، ذکاوت اور قابلیت کا قائل اور معترف ہو جانا پڑتا ہے۔ انھوں نے مثنویات، قصائد، غزلیات اور دیگر اصناف سخن کے علاوہ نثری تخلیق کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا۔ حق یہ ہے کہ ان کے

مجاز

ایک رومانی افسانہ

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضراب الم
ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

رشک صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہگار رہوں میں

اسرار الحق ــــ ایک ایسی پُر اثر شخصیت کا نام ہے جس نے مجاز ہوتے ہوئے ہمیشہ حقیقت کو شرمندۂ وجود کیا۔

لاوجود سے وجود کی دنیا تک آتے آتے حقیقت میں مجاز نے ۱۹۱۱ء کا سال منتخب کیا۔ ٹھیک ۱۹ اکتوبر کی تاریخ کو انھوں نے اودھ کے ایک مردم خیز قصبہ ردولی میں جاگیرداروں اور تعلقداروں کے ایک متمول اور خوش حال خاندان کے فرد چودھری سراج الحق کے گھر آنکھ کھولی۔ ان کی پیدائش پر خوشیوں کے شادیانے بجے اور خاندانی روایت کے مطابق معاشی خوش حالی، زمیندارانہ جاہ و جلال، نفاست، خوش سلیقگی، خوش مزاجی، وضعداری، آن بان اور عیش و عشرت کے مظاہرے کے طور پر بڑی دھوم دھام سے جشن ولادت منایا گیا۔ والدین کی ان سے جذباتی وابستگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان سے پہلے ان کا ایک دو ڈھائی سالہ بچہ بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو چکا تھا اس لئے مجاز بڑی منتوں مرادوں میں پالے گئے۔

چودھری سراج الحق اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد خواجہ ہال والے آبائی مکان سے منتقل ہو کر سسرالی مکان واقع محلہ نبی خاں میں رہنے لگے تھے۔ یہیں مجاز اور دوسرے بچے پیدا ہوئے۔ یہ مکان اب ایک زنانہ اسکول کی شکل میں قائم ہے اور سڑک کی طرف کچھ دکانیں اب بھی موجود ہیں جو مجاز کی یاد میں ردولی مخدومیہ اسکول کے نام وقف کر دی گئی تھیں۔ اس کے بعد اس خاندان کا ردولی سے کوئی سلسلہ باقی نہ رہا۔

یہ ہے اودھ کے مشہور اور مردم خیز قصبہ ردولی کا وہ ناقابل فراموش

مرکز جس نے مجاز کو ردولی سے چھڑا کر ساری اردو دنیا میں "آوارہ" کر دیا — ردولی ہی کے کسی ایک مکتب میں مجاز کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا جس کا نام و نشان بھی اب باقی نہیں ہے۔

مجاز کے والد چودھری سراج الحق اب مستقل بود و باش اختیار کرنے کی غرض سے لکھنؤ آ گئے تھے۔

کشش لکھنؤ ارے توبہ

پھر وہی ہم وہی امین آباد

سب سے پہلے پرانے نظیر آباد میں منشی احترام علی علوی کاکوروی کی "کاکوری کوٹھی" کے سامنے والے مکان میں سکونت اختیار کی پھر امین آباد کے محلہ کچہ احاطہ میں قیام کیا۔

یہیں مجاز نے امین آباد انٹر کالج سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں انھیں ہاکی سے بہت دلچسپی تھی۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی مشق کے لئے وہ اپنے گھر کے آنگن میں پلنگ کھڑے کر کے برابر مشق کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسی زمانے میں شاعری کا بھی آغاز کر دیا تھا۔

مجاز کے میٹرک پاس کرتے ہی ان کے والد کا تبادلہ آگرہ ہو گیا جس کی وجہ سے مزید تعلیم کے لئے آگرہ ہی کا انتخاب کیا گیا۔ اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں ان کا داخلہ ایف۔ ایس۔ سی میں ہوا۔ ۱۹۲۹-۳۰ء اور ۱۹۳۰-۳۱ء کے دو تعلیمی سال مجاز کی ادبی زندگی کے لئے نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوئے۔ یہاں معین احسن جذبی ان کے کلاس فیلو اور آل احمد سرور ایک سال سینیئر تھے۔ دوسری خوش قسمتی فانی بدایونی کے پڑوس میں رہائش۔ اور پھر میکش اکبر آبادی کی ادبی صحبتوں میں شمولیت۔ عابد حسین قادری

سے ادبی ملاقاتیں ۔ ان سب وجوہات نے اسرار الحق کو سب سے پہلے شہید تخلص اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اسی زمانے میں انھیں اپنی چند غزلوں پر فانی بدایونی سے اصلاح لینے کا موقع ملا ۔ اس طرح قیام آگرہ ان کے ادبی ذوق کی تکمیل کا ایک وسیلہ بن گیا ۔ دو سال کے مختصر قیام کے بعد علی گڑھ چلے گئے ۔ جہاں گھر کے دوسرے افراد پہلے ہی سے موجود تھے ۔

سرشار نگاہ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی نسرین سے رشتے جوڑے ہیں

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود ہم نے آگ لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے یہ دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

علی گڑھ میں پانچ سال قیام کے دوران مجاز نہایت آسودگی کے ساتھ رہے۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب ان کی زندگی اور شاعری نے اپنی صحیح سمتوں کا تعین کیا۔ مسلم یونیورسٹی کی عام فضا اور اشتراکی ذہن رکھنے والے کچھ نوجوان ساتھیوں نے مجاز کی شاعری اور شخصیت کو "شان کجکلاہی" اور "مرد انقلابی" کا بانکپن عطا کیا ۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب مجاز نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے بار بار یہ غلو آمیز اعلان کیا ؎

شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرق شراب و شبستاں نہیں میں

حالانکہ زندگی بھر وہ اسی وادی پر خار کے مسافر رہے ۔ اور ہمیشہ گھومتے پھرتے

رہنے کے باوجود وہ اس چوراہے کی مسافت طے نہ کر سکے۔ بعد کے چند سال علی گڑھ یونیورسٹی اور ترقی پسند تحریک کے عروج کے آئینہ دار تھے۔ اس زمانے میں اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور، سبط حسن، جذبی، سردار جعفری، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر اور سعادت حسن منٹو جیسے نامور قلم کار علی گڑھ پہونچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں مجاز نے اپنے ابتدائی دور شاعری کی کچھ اہم نظمیں لکھیں، ہاں ۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کو اپنا محبوب اور مثالی شاعر تصور کرتے تھے ۔ آخر۔ اختر شیرانی کی معصومیت اور رنگینی۔ جوش کی رندی و بیباکی۔ اور حفیظ کی نغمگی نے مل جل کر ایسا رنگ اختیار کیا کہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کے نمایاں شاعر کی حیثیت سے مجاز سب سے خوبصورت اور اثر انگیز شاعری کے خالق قرار پائے۔

۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے اردو میں انھوں نے داخلہ لے لیا۔ شاعری میں بے پناہ شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے خلاف روایت وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس وقت کے مجاز کا حلیہ کچھ اس طرح تھا:

> جسم پر یونیفارم کے رنگ کی نیلی شیروانی جس پر سفید بٹنوں کی تین تین دھاریاں پڑی تھیں اور شروع سے آخر تک سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ علی گڑھ پاجامہ، براؤن رنگ کا شو، بغل میں کتابیں، لمبا سا قد، سانولا رنگ، چہرے پر متانت اور سنجیدگی۔ آپ ہیں اسرار الحق۔ مجاز۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ اور۔ ایک ہونہار شاعر۔

یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا دورِ شباب تھا۔ دوستوں کی واہ واہ حسین خواتین کی داد اور مشاعروں کی مقبولیت نے ان پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانۂ قیام میں مجاز یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی صاحبزادی پر عاشق ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سے بھی ان کی ہمت افزائی ہوئی تھی اور پروفیسر صاحب کو بھی اس معاملے کا علم تھا۔ صاحبزادی نے مجاز کی چچیری بہن صفیہ کے ذریعہ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ مجاز سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن مجاز نے صاف انکار کر دیا۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

مجاز بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ یہ دلکشی شاعر کی حیثیت سے

ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ انھوں نے ایسی طبیعت پائی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لئے ان کے کلام سے واقف ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آیا تو مجاز بھی ملازم ہو کر دہلی پہونچ گئے۔ وہ ریڈیو کے اردو رسالے "آواز" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اس رسالے کا نام انھیں کا تجویز کیا ہوا تھا۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں کا آغاز بھی مجاز ہی کی غزل سے ہوا ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر مسٹر فیلڈن اور ان کے نائب پطرس بخاری کے ادبی ذوق کی بنا پر مجاز کے علاوہ ن۔م۔ راشد، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر وغیرہ بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ریڈیو کی ملازمت اختیار کر کے دہلی پہونچ گئے۔ ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حلقہ دہلی میں موجود تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر مجاز ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔ یا علیحدہ کر دئے گئے۔ ایک طرف شغل نادنوش کی وجہ سے پیدا ہوتے والی بے اعتدالیاں دوسری طرف ایک خاص قسم کی ظرافت، فقرے بازیاں اور جملے کسنے کی عادت۔ انھیں سب نے سنگین صورت اختیار کر لی۔

وہاں کا حسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے

قیام دہلی کے دوران دو باتیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو شراب نوشی کی عادت لت کی شکل اختیار کر گئی۔ اور مجاز اس میدان میں اپنے دوستوں اور ہم عمروں سے آگے نکل گئے۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ انھیں ایک غلط مرتبت

"زہرہ جبیں" سے عشق ہوگیا۔

دہلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی۔ چنچل،
البیلی، خوبصورت، لاڈ پیار میں پلی ہوئی، عیش
وعشرت کی عادی، ایک عدد بھاری بھرکم شوہر
کی ملکیت یا مالک جو بھی سمجھئے ۔۔۔؟

اب تک دل میں جو زخم آئے وہ ہلکے تھے۔ مگر یہ زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ عمر بھر نہ گئی۔ شروع میں دلنوازی اور لطف وکرم سب کچھ تھا۔ اور بعد کو ۔۔۔ آوارہ و مجنوں کے خطاب ملنے لگے۔ نصیحتیں کی جانے لگیں۔ آخر دربان کو حکم ہوا کہ مجاز پھاٹک میں بھی قدم نہ رکھنے پائے۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کے واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اس حادثے نے مجاز کی ہستی کو پاش پاش کر دیا۔ وہ ریزہ ریزہ بکھر گئے اور تباہیوں کی آندھی انھیں اڑا لے گئی۔ مجاز اپنے ہی مذاق طرب انگیں کا شکار ہوئے یا سماج نے اس ذہین، حساس اور ہونہار نوجوان شاعر کو توڑ دیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ معصومیت میں "شوق کی بلندی" اور "ہمت کی پستی" کا نشانہ بن کر رہ گئے ؎

رگ رگ میں دھلنے کی اتر کیوں نہیں جاتے
جب ٹوٹ گئے ہو تو بکھر کیوں نہیں جاتے

ملازمت ختم ہونے کے بعد کچھ دنوں دہلی ہی میں رہے۔ پھر دوسرے شہروں کے چکر لگاتے رہے۔ یہ طائر آوارہ بے سمت اڑانوں میں کب تک زندگی بسر کرتا۔ آخر اپنے مرکز کا رخ کیا۔ اور لکھنؤ آکر اپنے والدین کے ساتھ محلہ نیو حیدر آباد کے "دارالسراج" میں قیام کیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ سبط حسن، علی سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، معین حسن جذبی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور احمد علی وغیرہ سب لکھنؤ ہی میں موجود تھے ـــــ ایک خاتون نے اپنا لالباغ کا فلیٹ دفتر قائم کرنے کے لئے دے دیا۔ اور "پرچم" نکلنا شروع ہوا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز اس کے معاون مدیروں میں شامل تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مجاز، سردار جعفری اور سبط حسن نے مل کر "نیا ادب" نکالا۔ اسی سال جوش ملیح آبادی بھی لکھنؤ آگئے اور ان کا رسالہ "کلیم" "نیا ادب" میں ضم ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس حلقے کی چار قسم کی سرگرمیاں تھیں۔ تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ

ساتھ پورا انصاف کیا ہے ۔ ان کا کلام صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے لاثانی اور لافانی ہے ۔

کلام خسرو اپنی گوناگوں خصوصیات اور محاسن کے لئے تاریخ شعر فارسی میں ایک نمایاں، منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے ۔ خسرو کو فارسی اور ہندی زبانوں کی مشترکہ شاعری کا موجد اور بادا آدم تسلیم کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں پرورش اور پرداخت پانے والے فارسی شاعری کے ایک خاص طرز "سبک ہندی" کے تاجدار اول کے طور پر بھی ان کی عظمت اور اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم اور برقرار ہے ۔ ان کے کلام کے رنگ و آہنگ، موضوعات و عنوانات اور لفظی و معنوی حسن و قبح کو تنقید کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کے بجائے زیر نظر سطور میں صرف اس امر کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ خسرو کے کلام میں وطن دوستی اور قومی یکجہتی کے عناصر کس حد تک موجود ہیں جن کی وجہ سے انھیں ہندوستانی شعراء میں "پہلا قومی اور عوامی شاعر" ہونے کا شرف امتیاز حاصل ہے ۔

خسرو کے منظوم و منثور شاہکاروں کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے ۔ اپنے وطن سے ان کی محبت اور بھائی چارے کا اظہار دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر صحیح معنوں میں ان کے دل میں موجود تھا ۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں تقریباً ہر شخص وطن کو اپنی جائے پیدائش یا اپنے قریہ، گاؤں، موضع، شہر وغیرہ کے معنی میں استعمال کرتا آیا ہے ۔ لیکن خسرو نے لفظ "وطن" کے معنی اور مفہوم کو وسعت اور ہمہ گیری بخشی، وہ سارے ہندوستان کو اپنا وطن شمار کرتے ہیں ۔ اور یہاں کے عوام اور خواص، شہر و بازار، دریا پہاڑ، پھل پھول، درخت پودے، کھیت کھلیان، جنگلات اور باغات غرضکہ حسن قدرت کے تمام مظاہر سے شیفتگی اور دیوانگی کی حد تک محبت کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک خاک وطن کا ہر ذرہ کیمیا سے بہتر ہے ۔ خسرو کے فکر و فن کی یہی سب سے بڑی انفرادیت

گردی۔ ہر چند کہ یہ حلقہ نو عمر ترقی پسندوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں متعدد لوگ ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے خصوصاً مجاز اس حلقہ میں بہت مقبول تھے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد یہ حلقہ منتشر ہو گیا۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۴۰ء میں حالات سے پست مجاز پر جنون کا پہلا دورہ پڑا۔ دراصل یہ نروس بریک ڈاؤن کا حملہ تھا۔ دہلی کے معاشقے کی ناکامی اور "نیا ادب" کے ساتھیوں کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے اندر ہی اندر سلگتے سلگتے آخر یہ آتش فشاں پھوٹ ہی پڑا۔ علاج معالجے سے صحت ٹھیک ہوئی۔ تو پھر تلاش معاش کی فکر لاحق ہوئی کچھ دن بمبئی کے محکمۂ اطلاعات میں کام کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔ پھر ۱۹۴۳ء میں دہلی کی ہارڈنگ لائبریری میں ایک معمولی سی ملازمت مل گئی۔

اس ملازمت کے دوران گھر والوں نے مجاز کی شادی ایک برسر روزگار خاتون سے طے کر دی۔ وہ دہلی سے لکھنؤ بر دکھوے کے لئے آئے لیکن ان خاتون کے والد نے یہ رشتہ نامنظور کر دیا۔ اس رشتے کے ٹھکرا دئے جانے کا مجاز کے حساس ذہن پر بہت برا اثر پڑا جس کے نتیجے میں ان پر جنوں کا دورہ دوبارہ پڑا۔ لکھنؤ میں ڈاکٹروں کی کوششوں اور گھر والوں کی دلجوئی سے دھیرے دھیرے طبیعت سنبھل گئی۔ جنون کی اس حالت میں وہ اپنی عظمت پر بہت زور دیتے تھے۔ شاعروں کی فہرست تیار کرتے تو غالب اور اقبال کے بعد اپنا نام لکھتے اور فہرست ختم کر دیتے۔ عالم یہ تھا کہ اب انھیں زندگی بسر کرنے کی فکر نہ تھی، زندگی کو خود ضرورت ہو تو انھیں بسر کر لے۔

کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا، چلتے دیکھ کر چل پڑنا،
بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا، اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان
کے پیچھے سرک جانا، عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا،
جسم تو ہے مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات

کہاں بھٹک رہے ہیں ۔ مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ
سوکھے پتوں کی طرح، آواز گویا کوسوں دور سے
گرتی پڑتی چلی آرہی ہے ۔ !

سنہ ۱۹۴۹ء میں کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں شریک ہوئے پاکستان سے واپس آئے تو پھر وہی بے اعتدالیوں کا دور شروع ہوگیا ۔ شراب، مشاعرے، یاران بے ہنگام، شہروں شہروں کی آوارہ گردی، اپنے آپ سے مجرمانہ حد تک غفلت ۔

غرضکہ مختلف علاقوں کی "شہر نوردی" کرکے لکھنؤ واپس ہوئے تو جنون کا تیسرا حملہ ان پر پوری طرح حاوی تھا ۔ اور اسی عالم میں وہ جوش ملیح آبادی سے سخت ناراض تھے ۔ جوش نے بھی ان کے لئے ایک طویل نظم "پندنامہ برائے اصلاح میاں مجاز" لکھی تھی ۔ اس نظم سے مجاز کو ایسی ٹھیس لگی کہ وہ رانچی کے دماغی اسپتال میں اپنی اسی جنونی کیفیت میں اکثر اس قسم کے مصرعے لکھا کرتے تھے ؎

فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں
مجاز ہوں سرفروش ہوں میں

وہ یہ مطلع بھی بار بار پڑھتے تھے ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اس زمانے میں وہ کہتے تھے شاعر صرف دو ہیں ۔ فیض اور مجاز بس ۔ ان دنوں ان کے منہ سے اکثر یہ جملہ بھی ادا ہوتے تھے ۔

جہاں پناہ ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے ۔
ناشاد مراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے ۔

بس ہو چکے بہانے چلو تھانے ۔

اب پھر دہلی جانا ہے ۔ چار نوکریاں اور دو بیویاں میرے گرد گھوم رہی ہیں اور پھر بھگتنا ہے انھیں ۔

رانچی میں تقریباً چھ ماہ علاج کرنے کے بعد صحت یاب ہو کر گھر لوٹے ۔ آل احمد سرور سے ملنے گھر گئے تو کہنے لگے ۔ "سرور صاحب رانچی میں ایک بہت بڑا تجربہ کیا ہے ۔۔ شراب سے نشہ نہیں ہوتا ، آدمی پاگل ہو جاتا ہے ۔

۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ میں طالب علموں کی طرف سے ایک اردو کنونشن تھا اور مشاعرہ بھی ۔ ملک کے [illegible] مایہ ناز ادیب اور شاعر شرکت کے لیے آئے تھے ۔ ایسے اجتماعات اور مشاعروں کے موقع پر تجدید دوستی کے لئے شراب سب سے موثر ذریعہ سمجھی جاتی ہے ۔ مجاز نے مختلف دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کا سلسلہ شروع کیا تو یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے تیسری سے چوتھی تاریخ تک چلا ۔ تیسری کی شب میں بارہ دری قیصر باغ میں مشاعرہ ہوا تو مجاز اپنے قابو میں تھے ۔ کئی نظمیں ، غزلیں سنائیں اور خوب داد پائی ۔ لیکن ان کے اندر چھپا ہوا مجاز بول رہا تھا ۔

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

۴ر دسمبر کو ساحر لدھیانوی اور سردار جعفری کی کوششوں کے باوجود ان کی غیر موجودگی میں مجاز کے کچھ لتی شرابی دوستوں نے آخر انھیں ہتھیا ہی لیا ۔ رات میں ساڑھے نو بجے کے قریب وہ لکھنؤ کے کچھ ادیبوں کو ملے تو نشے میں دھت تھے اور شراب کے لئے روپے طلب کر رہے تھے ۔ آخر ایک "نو دولتیا" دوست انھیں مل ہی گیا ۔ یہ لوگ لال باغ کے ایک شراب خانے میں پہنچے

اور رات تین بجے تک شراب نوشی کا سلسلہ جاری رہا۔ بقیہ لوگ تو دامن بچا کر کھسک لئے اور مجاز وہیں کھلی چھت پر سردی میں پڑے رہے۔ پانچ دسمبر کو دن میں شراب خانے والوں نے جب انھیں بیہوش پڑا پایا تو بلرام پور اسپتال پہونچا یا گیا۔ ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا۔ کسی طرح جب ان کے گھر اور گنگا پرشاد ہال میں اطلاع پہونچی جہاں اردو کنونشن ہو رہا تھا تو سب ہی پر جیسے بجلی گر پڑی اور سب فوراً اسپتال پہونچے تو آکسیجن دی جا رہی تھی دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں ۔ آخر کار رات کو دس بجکر بائیس منٹ پر ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

۶ر دسمبر کی شام کو جنازہ پانچ بجے شام کو "دارالسراج" سے اٹھ کر روانہ ہوا اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں نشاط گنج کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اس سے قبل لکھنؤ میں نہ تو کسی شاعر کی موت پر اتنا سوگ منایا گیا تھا اور نہ اتنی کثیر تعداد میں مختلف مذہبوں کے لوگ کسی کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

۷ر دسمبر ۱۹۵۵ء کی شام کو رفاہ عام کلب کے وسیع وعریض ہال میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب سے موثر تقریر عصمت چغتائی نے کی تھی۔

> میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی غصے میں کہا "اس سے بہتر ہے مجاز کہ تم مر جاتے"
> مجاز نے جیسے منہ پر طمانچہ مار دیا اور کہا " لو میں مر گیا تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں "

فردوس حسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ

ہر سمت اک ہجوم نگارانِ لکھنؤ
اور میں کہ ایک شوخ غزلخوانِ لکھنؤ

مطرب بھی ہے شراب بھی ابر بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نوبجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

اردو میں ریڈرشپ کا مسئلہ

(اردو کتابی میلہ ۱۹۷۸ء کے موقع پر)

تقریباً دس سال قبل ایک ملاقات کے دوران مشہور افسانہ نگار انجانی کرشن چندر نے کہا تھا کہ "ہم نے بڑے خوشگوار ماحول میں اپنی زندگی گزار دی۔ ہمارا دور اردو نشر و اشاعت ارسال و ترسیل اور افہام و تفہیم کے سلسلہ میں زریں دور کہا جا سکتا ہے لیکن مجھے آنے والے زمانے کے بارے میں گہری تشویش ہے جب ہماری شاہکار تصانیف اپنے قارئین کو ترسیں گی۔"

اردو نظموں کے مجموعہ "یادوں کے گلاب" کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے اتر پردیش کے اس وقت کے گورنر میر اکبر علی خاں نے صاف لفظوں میں کہا تھا۔ "ہم نے اتر پردیش میں چار ہزار اردو اساتذہ کی تقرریاں کیں لیکن اردو والے اتنی تعداد میں اردو کے طالب علم فراہم کرنے میں بھی ناکام رہے۔"

اتر پردیش جنتا سرکار کے ایک وزیر قاضی محمد محی الدین نے جشن جمہوریت کے سلسلہ میں ایک مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "اردو کے چار ہزار اساتذہ میں سے زیادہ تر اپنے اسکولوں میں اردو کے بجائے دوسرے مضامین پڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے تجربات، مشاہدات اور ذاتی معلومات کی بنا پر بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی تھی۔

اردو کے ایک طالب علم نے نمائش کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے دی تھی کہ۔" اس نمائش میں شامل اردو کی اسّی فیصد کتابیں صرف وہ لوگ خرید سکتے ہیں جو فیشن کے طور پر کتابیں خریدتے ہیں اور جنھیں واقعی اردو زبان

وادب سے لگاؤ ہے ان کا اسّی فیصد طبقہ یہ کتابیں خرید نے سے یکسر قاصر ہے"

اسی نمائش میں سولہ صفحہ پر مشتمل ایک کتابچہ کی ضرورت سے زیادہ قیمت (ایک روپیہ پچانوے پیسے) پر کچھ لوگ سرگرمی سے بحث کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ ان میں سے بعض کا کہنا تھا کہ "اردو کتابوں کی اشاعت اتنی دشوار اور مشکل نہیں ہے۔ بلکہ دراصل مسئلہ ان کے سرکولیشن کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کتاب صحیح ہاتھوں میں پہونچ بھی پاتی ہے یا صرف تکلف، فیشن اور رواداری کی نذر ہوجاتی ہے"

اس سلسلہ میں اقلیتی یونٹ فورم لکھنؤ کے جنرل سکریٹری مسٹر عتیق الرحمٰن نے ایک دلچسپ لطیفہ سنا کر بحث کا اختتام کیا۔ انھوں نے تحقیقوں کے دوران یہ انکشاف کیا کہ "ایک بڑی تجارتی فرم کے ناخواندہ مالک نے اپنا نیا بنگلہ بنوایا اور اس کی ہر طرح سے آرائش و زیبائش کی۔ دوسروں پر رعب جمانے کے لئے انھوں نے عمارت کی مناسبت سے ایک کمرہ لائبریری کے لئے بھی مختص کر دیا۔ اس کمرے میں شاندار الماریوں نیز دوسرے فرنیچر کی تزئین و ترتیب کے بعد مذکورہ تاجر نے شہر کے ایک کتاب فروش کو بلا کر یہ دلچسپ "آرڈر" دیا کہ تمام الماریوں میں تین روپے فٹ کے حساب سے کتابیں بھر دی جائیں" ظاہر ہے جو کتابیں وہاں سپلائی کی گئیں وہ کس معیار کی ہوں گی اور صاحبان ذوق کی علمی ادبی پیاس بجھانے کے لئے کس درجہ کامیاب ثابت ہوسکیں گی۔

اردو کی مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے پچھلے سال کرشن چندر کی پہلی برسی پر ایک جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کیا کہ "اردو زبان روز بروز مردہ اور ازکار رفتہ ہوتی جارہی ہے چونکہ اس زبان کا معاشیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہ گیا ہے اس لئے اس کے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو پڑھ کر ہمارے بچوں کو اچھی نوکری اور لڑکیوں

کو اچھے برنہیں مل پاتے اس لئے ہم اپنے بچوں کو انگریزی اور دوسرے علوم کی تعلیم دینے کی طرف زیادہ مائل ہوتے جارہے ہیں۔"

ایک اردو دوست شکلا جی نے (جو یونائیٹڈ کمرشیل بینک لکھنؤ یونیورسٹی شاخ میں ایک ذمہ دار عہدہ پر متمکن ہیں) ایک گفتگو کے دوران بتایا کہ انھیں لکھنؤ کی قدیم تہذیب سے بہت گہری دلچسپی ہے اور اس کے پیش نظر انھوں نے عبدالحلیم شرر کی "گزشتہ لکھنؤ" اور بعض دوسرے اردو مصنفین کے انگریزی ترجمے پڑھ کر کسی حد تک اپنے ذوق کی تشفی کی ہے۔ لیکن یونیورسٹی بینک کی تقریباً پندرہ سال کی ملازمت کے دوران متعدد اہل دانش سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود انھیں کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو انھیں اردو رسم خط پڑھنا سکھا دے تاکہ ان کی یہ مجبوری ختم ہو سکے۔

اتفاق سے یہ ساری شکایات صرف اردو ریڈرشپ کا فقدان ہونے سے متعلق ہیں اس لئے اس سلسلہ میں تمام اردو دوستوں کی توجہ درکار ہے۔ اگر ہم "لکھنے پڑھنے" کے ساتھ ہی ساتھ "لکھانے پڑھانے" کے لئے اپنے تھوڑے سے وقت کی بھی قربانی دے سکیں تو شاید اردو ریڈرشپ کے مسئلے کا کوئی موثر حل نکلنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور ان حالات میں ہمیں کرشن چندر کی بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ "اب وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری شاہکار تصانیف اپنے قارئین کو ترسیں گی۔"

کہانی کی کہانی

اور خصوصیت ہے جس کے سبب انھوں نے ہندوستان کے پہلے "قومی اور عوامی شاعر" کی حیثیت سے سند قبولیت اور اپنے ہم عصروں نیز متاخرین میں امتیاز خاص حاصل کیا۔ خسرو کے کلام میں جا بجا ایسے عناصر اور مضامین موجود ہیں جن کی مدد سے ساتویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مختلف قوموں، فرقوں اور گروہوں کے درمیان رشتۂ یکجہتی کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوششوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں یکجہتی کے سلسلے میں جو بیانات ملتے ہیں، ان میں عوام کے تمام فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور رسوم و رواج کی باہمی پابندیوں کو قبول کرنے کی تمام فریقوں سے پرزور اور مدلل سفارش کی گئی ہے۔ خسرو کے فنی شاہکاروں میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں جن میں سرزمین وطن کی عظمت اور خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے وطن، یہاں کے عوام، مناظر قدرت، رسوم و رواج اور در و دیوار سے اپنی محبت کا اظہار اتنے موثر پیرایہ میں کیا ہے کہ دوسروں کے دلوں میں بھی حب وطن اور باہمی اتفاق کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

کلام خسرو میں دوسرے شعراء کے کلام کی بہ نسبت قومی یکجہتی اور وطن پرستی کے جذبات و خیالات پر مشتمل بہتے اشعار، آثار اور اشارے ملتے ہیں وہ اپنی حقیقت کو ہر ایک سے تسلیم کروالینے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ خسرو کے کلام میں ان عناصر کی بہتات اور وافر نمایندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر آخر کیوں موجود ہے؟۔ تو چند نکات ایسے بھی زیر غور آئیں گے جو شاعر کی مذکورہ شاعرانہ حیثیت اور شخصیت کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مختلف النوع مکتبہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کسی ایک نقطۂ نظر یا مرکز خیال پر مجتمع کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ ان کی دلوں اور تہذیبوں کے درمیان فاصلے کی جو خلیج ہو اولاً اسے پر کیا جائے۔ خسرو نے وقت کی

ترجمہ کا فن بہت سے افادی پہلوؤں کا علمبردار ہے، کسی ملک کی زبان تہذیب اور معاشرت کی جھلکیاں دیکھنا ہوں تو وہاں کے ادب سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے لیکن کسی بھی ادب سے واقفیت اس وقت تک قطعی ممکن نہیں ہے جب تک اس ملک کی زبان کا خاطر خواہ علم حاصل نہ کیا جائے۔ اور یہ کسی شخص کے لئے غیر ممکن ہے کہ وہ دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وہاں کی زبان سے نہ صرف واقفیت حاصل کرے بلکہ اس کا اچھا خاصہ مطالعہ بھی کرے۔ اس دشواری کے سدّباب کے لئے ترجمہ کا فن بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ترجموں کے ذریعہ ہمیں دنیا کے مختلف ملکوں اور وہاں بسنے والی قوموں کی زبان، تہذیب، تمدّن، ادب، معیار زندگی اور انداز فکر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

مولانا حالی نے ترجمہ کے فن کی اہمیت اور افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے اصل تخلیق سے بھی اہم قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ تخلیق تخلیق ہے، اور وہ جس زبان میں لکھی جائے اس زبان کے جاننے والے اسے پڑھ کر تعریف کریں یا ناپسند کر دیں لیکن اس زبان کے علاوہ جس میں تخلیق نے جنم لیا ہے دوسری زبانوں کے جاننے والے جن کی تعداد کثیر بھی ہو سکتی ہے اس تخلیق سے محروم اور بے بہرہ رہ جائیں اگر ترجموں کے ذریعہ وہ عبارتیں ان تک نہ پہونچائی جائیں۔ اسی لئے انھوں نے ترجمہ کو تخلیق سے بڑا درجہ دیا ہے۔

مولانا حالی کے اس خیال کے باوجود اردو ادب میں ترجمہ کے فن کو نہ مقبولیت اور اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جو ہونا چاہیئے تھی۔ فن ترجمہ نگاری مدت تک ناقدری کا شکار رہا۔ ماضی میں اس سمت کچھ قابل ذکر ادیبوں نے توجہ کی اور مختلف زبانوں کے اچھے شاہکار اردو میں منتقل ہوئے لیکن موجودہ دور میں پھر تعطل اور جمود طاری ہے اور ترجمہ کا کام جتنی تیزی سے ہونا چاہیے ہو نہیں رہا ہے۔ اور اگر اس کی طرف بھرپور توجہ نہ کی گئی تو یہ فن مستقبل قریب میں انحطاط کا شکار ہو جائے گا۔

زیر نظر کتاب "بدیسی کہانیاں" اس خیال کے تحت تیار کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے کئی ایسے اہم ممالک کا کلچر تمدن اور وہاں کے معیار ادب کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آئے گا۔ جو ممالک دنیا میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں کے عوام اور ان کے طرز معاشرت سے ہندوستانی عوام کو کسی قسم کی دلچسپی اور اشتیاق بھی ہے۔ "بدیسی کہانیاں" میں فارسی، روسی، برطانوی، امریکی، فرانسیسی، ڈینش اور چینی زبان کی منتخب کہانیوں کے تراجم شامل ہیں۔

ہر ملک اور ہر قوم کی اپنی انفرادی حیثیت ہوتی ہے۔ جغرافیائی حالات، موسم، ماحول، تہذیب، ثقافت، زبان، طرز رہائش اور لباس وغیرہ کے بارے میں ہر ملک کی تفصیل دوسرے ملکوں سے علیحدہ اور مختلف ہے۔ یہ فرق ان ممالک میں لکھی جانے والی کہانیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کسی ملک کے عوام غریب ہیں کہیں کے امیر، کہیں روزمرہ کی زندگی میں سہولیات کی فراوانی ہے کہیں ان کا انحطاط، کہیں کا معاشرہ بہت زیادہ ترقی پسند اور ترقی پذیر ہے تو کہیں ابتذال کا دور دورہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو حالات امریکہ اور روس کے ہیں وہ ایران اور ڈنمارک کے نہیں ہو سکتے اور جو برطانیہ اور فرانس کے ہیں وہ دوسرے ممالک کے نہیں ہو سکتے حالات کے اس فرق کے باوجود زیر نظر کہانیوں اور ان کے تخلیق کاروں کو منتخب

کرتے وقت اس مشکل کا احساس ہوتے ہوئے بھی کہ اردو زبان کا جو اپنا مزاج ہے وہ فرق کے اس وزنی بوجھ کو برداشت کر بھی سکے گا۔ یا نہیں؟۔ بہرحال حتی الامکان یہی کوشش کی گئی ہے کہ اصل کہانی جس ملک، زبان یا قوم سے متعلق ہو، جس ماحول میں لکھی گئی ہو اور اس کا جو بھی مزاج ہو وہ ہندوستانی زبان، ماحول، مزاج اور معاشرے میں ضم ہو جائے اور دونوں زبانوں کے اختلاط سے ایک ایسا لہجہ مقرر ہو جائے جو حقیقت پسندانہ بھی ہو اور قرین قیاس بھی۔ ترجمہ کے لئے کہانیوں کا انتخاب کرنے میں عام طور پر بہت دقّت ہوتی ہے، اس لئے میں نے یہ درد مول ہی نہیں لیا۔ جو کہانی پسند آگئی اس کا ترجمہ کر لیا، اس میں کسی قسم کا امتیاز قطعی نہیں ہے۔ اور نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام کہانیاں اپنے ملک اور اپنے وقت کی واحد نمائندہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے علاوہ دوسری اچھی کہانیوں اور کہانی کاروں کی موجودگی بھی ناگزیر ہے۔ لیکن زیر نظر کہانیوں میں جن واقعات یا حادثات کو اصل موضوع بنایا گیا ہے اور ان موضوعات کے پس منظر میں جو حالات چھپے ہوئے ہیں ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کو ہندوستانی ماحول اور معاشرے میں بآسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور معمولی ردّوبدل کے بعد ان میں اردو کلچر کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کہانیوں کے انتخاب اور ترجمہ میں اسی امر پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ہندوستانی ماحول اور معاشرے کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ روزمرّہ کی بامحاورہ زبان کی چاشنی اور دلکشی برقرار رہے۔ حالانکہ اس کام میں ہر قدم پر دقّت پیش آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی کے علاوہ دوسری تمام زبانوں کی کہانیاں براہ راست اسی زبان سے ترجمہ نہیں کی گئی ہیں جس میں اولاً لکھی گئی تھیں بلکہ ان کا ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔ اس طرح سے اس مجموعہ میں شامل زیادہ تر کہانیاں دراصل "ترجمہ کا ترجمہ" کہی جا سکتی ہیں۔ کسی کہانی کو ایک زبان سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان میں منتقل کرنے کے بعد اس کی

اصلیت اور کشش کو برقرار رکھنا ایک مشکل کام ضرور ہے۔ لیکن مشکل کو آسان کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور زبان و بیان کو صاف، سلیس، سادہ اور پُر اثر بنانے کے لئے کہیں کہیں اصل تخلیق کار کے بجائے اپنے قلم پر بھروسہ کرنا پڑا ہے۔

"بدیسی کہانیاں" میں کل چودہ کہانیاں شامل ہیں۔ چار فارسی۔ دو روسی دو فرانسیسی، دو چینی، دو انگریزی (ایک برطانوی اور ایک امریکی)، ایک ڈنمارکی اور ایک اپنی کہانی۔

جدید فارسی زبان کے مختصر افسانے اپنی آب و تاب کے لحاظ سے دنیا کے منتخب افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں، علی دشتی، ڈاکٹر سعید نفیسی اور شیین پرتو نے فارسی افسانے میں جان ڈال دی ہے اور جمالزادہ فن کے ذریعہ افسانوں کا سب سے بہتر اور کار آمد انتخاب مشہور ایرانی دانشور ڈاکٹر مہدی حمیدی نے کیا ہے جو "دریائی گوہر" کے نام سے تہران میں شائع ہو چکا ہے۔ مذکورہ بالا تخلیق کاروں کے شاہکار افسانے اسی انتخاب سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

میکسم گورکی اور پاستوسکی روسی ادیب ہونے کے باوجود ساری دنیا میں مشہور ہیں اور دنیا کی تقریباً سبھی ترقی یافتہ زبانوں میں ان کی تخلیق کے تراجم موجود ہیں۔ ان دونوں قلم کاروں کی کہانیوں کے متعدد مجموعے انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ "ایک کتاب" اور "عزت نفس" انھیں مجموعوں سے ماخوذ ہیں۔

فرانسیسی ادیب موپاساں اپنی فکر کی بلندی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی ملک کے ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑا مفکر، دانشور اور ادیب تھا۔ موپاساں افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب ہے۔ اس کا افسانوی مجموعہ "گی ڈی موپاساں" (موپاساں کی کہانیاں) اس مجموعہ میں شامل

موپاساں کے دونوں افسانے اسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

انگریزی ادب کا سرمایہ گنج قارون سے کم نہیں ہے۔ اس زبان میں ایسے منفرد اور ممتاز فنکاروں کے شہہ پارے موجود ہیں جو صرف انگریزی کیا دنیا کی ہر زندہ اور ترقی یافتہ زبان کے لئے قابل فخر ہیں۔ انگریزی کے چوٹی کے فنکاروں کے ترجمے اردو میں بھی برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں جو ترجمے شامل کئے گئے ہیں وہ بہت مشہور افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہیں۔ بیچکر دفٹ برطانیہ اور سیر نڈ یلو وہ ییر کا مشہور افسانہ نگار ہے۔ اول الذکر کے افسانوں کا مجموعہ "بین الاقوامی مختصر افسانے" (INTERNATIONAL SHORT STORIES) شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اور دوئم الذکر کی کہانی انگریزی کہانیوں کے ایک معیاری انتخاب "تیرہ عظیم کہانیاں" (THIRTEEN GREAT STORIES) میں شائع ہوئی تھی۔ مذکورہ بالا دونوں کہانیاں انھیں مجموعوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

چینی کہانیاں اپنے پلاٹ، ہئیت اور ساخت کے اعتبار سے دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کے چلتے پھرتے اور بات چیت کرتے ہوئے کردار کہانی کے خاتمہ پر یا تو روح ثابت ہوتے ہیں یا کسی اور مافوق الفطرت قوت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کہانیوں میں تجسس (SUSPENCE) اور کشش (ATTRACTION) اس قدر موجود ہے کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گو کہ یہ کہانیاں اصل چینی زبان کے بجائے اس کے انگریزی ترجمہ "چینی مختصر افسانے" (CHINESE SHORTSTORIES) مترجمہ لن یوتنگ سے ماخوذ ہیں اور دوسری کہانیوں کی طرح یہ بھی ترجمہ کا ترجمہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں کہانی پن باقی ہے۔ اور کہانی شروع کرنے کے بعد ختم تک پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

ڈنمارک کے مشہور زمانہ ادیب "کاج منک" کی کہانی بھی ایک

انگریزی رسالہ سے ماخوذ ہے - یہ کہانی اپنے ملک کی معاشرت، تہذیب، رہن سہن اور ماحول کی سچی تصویر ہے جسے ڈینیش زبان کا ایک شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔

"جوہو مرگیا" خالص ہندوستانی کہانی ہے - اس نے اسی ماحول میں جنم لیا ہے، یہیں پروان چڑھی ہے اور ہندوستانی ماحول اور معاشرے ہی میں اس کا اختتام بھی ہوتا ہے - ایک فنکار نے ساری عمر خون پسینہ ایک کرکے اپنے شاہکاروں کی تخلیق کی، وہ خود فاقوں کا شکار رہ کر بھی اپنے مجسموں کا پیٹ رنگ و روغن سے بھرتا رہا اور آخر مفلسی اور تنگدستی سے عاجز آکر دوا علاج کا احسان لئے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیا سے چل بسا - جوہو کی موت ایک فنکار کی نہیں بلکہ فن کی موت ہے - اس کے جذبۂ تخلیق کی موت ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے اس کی موت فکر کی دعوت دیتی ہے - اس کہانی کو مجموعہ میں شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس ہندوستانی ماحول اور معاشرے میں یہاں کی کہانی جنم لیتی ہے اس کا صحیح نقشہ کھینچ دیا جائے - تاکہ قارئین کو مترجمہ کہانیوں اور اصل اردو کہانی کے فرق اور مترجم کی دشواریوں کا کچھ اندازہ ہوسکے -

اس سلسلہ میں ماہنامہ "تحریک" دہلی، ہفت روزہ "واقعات" دہلی اور روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ بھی مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے ان کہانیوں کو مجموعی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ہی اپنے گرانقدر رسائل اور جرائد میں شائع کرکے میری عزت افزائی فرمائی ہے -

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ایاز اور ایازمند

لکھنؤ میں میرے ایک مخلص اور محسن کرم فرما ہیں۔ "پیدائشی علامہ صفت" صاحب موصوف شہر کے مشہور و معروف، وعدہ خلاف، جھکولے باز سفید جھوٹ بولنے والے، اور بسا اوقات آنکھوں میں دھول جھونکنے کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن بہرحال اس کے باوجود میں انھیں صاحب موصوف، مخلص محسن اور کرم فرما جیسے آداب و القاب کے ساتھ یاد کر کے اپنے شہر کے صاحبان ذوق کے ساتھ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتا بلکہ ان صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے تمہید باندھ رہا ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں عمداً یا سہواً صرف ایک "نیک کام" کیا ہے جس کے لئے اہل لکھنؤ کو ان کے دربار میں سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ اور وہ نیک کام ہے کلکتہ کے جواں سال و جواں فکر شاعر جناب غلام حسین ایازؔ کا اہل لکھنؤ سے تعارف کرانا۔

غلام حسین ایازؔ نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"ٹیگور و وحشت کی سرزمین بنگال میں ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حضرت شیخ امیر الدین لکھنوی مرحوم کے گھر ایک لڑکے نے جنم لیا جس کا نام انھوں نے غلام حسین رکھا اور جب شعر و ادب کے جراثیم اس میں پرورش پانے لگے تو غلام حسین کے ساتھ ایازؔ کا اضافہ ہو گیا۔ آج دنیا اسے غلام حسین ایازؔ کے نام سے جانتی ہے اور وہ ایازؔ میں ہوں۔ اگرچہ میرے آباؤ اجداد کا وطن لکھنؤ ہے لیکن بنگال مجھے اپنے ابتدائی وطن سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

گویا کہ اپنی عمر کے تقریباً سینتیس (۳۷) برس وہ سرزمین بنگال کی آغوش

میں گزار چکے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بنگالہ کی سرزمین یہاں کے تہذیبی رکھ رکھاؤ اور علمی و لسانی قدروں کے بڑے اچھے پارکھ ہیں اور اپنے وطن کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے ایک شعر بھی کہتے ہیں ؎

جو مر بھی جاؤں تو چھوٹے نہ شہر کلکتہ
کہ زندگی کا مزا مجھ کو اس دیار میں ہے

ایاز کی زندگی کے بارے میں تحریری طور پر صرف اس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں کہ انھوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب ادب کا دامن تھاما تو استاد عصر جناب شاکر کلکتوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور قدیم و جدید شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے ادب میں اپنی ایک ایسی راہ بنائی جو نہ تو قدیم ہے اور نہ بالکل جدید بلکہ ان کی شاعری قدیم اور جدید طرز سخن کی آمیزش سے "مئے دو آتشہ" بن گئی ہے۔ انھوں نے میانہ روی کا راستہ اختیار کر کے دونوں رنگوں کے امتزاج سے ایک نئی ڈگر قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

نئی نسل کے ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے ایاز کی شاعری کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"عہد حاضر کے کرب کا اظہار ان کے یہاں ایک مخصوص احتیاط کے ساتھ ہوا ہے جس میں عہد حاضر کو پوری طرح انگیز کرنے کا ولولہ بھی موجود ہے۔ وہ استعارے سے زیادہ اشارہ پر یقین رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا لہجہ شائستگی اور لطیف سے طنز کا حامل ہے، یہ ان کا مخصوص وصف ہے۔"

میں ذاتی طور پر ایاز سے زیادہ غلام حسین سے متاثر ہوں اس لئے کہ غلام حسین کے یہاں محبت اور خلوص کا جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے وہ ابھی ایاز کے یہاں نہیں ہے اس لئے کہ شاعر جب بوڑھا ہوتا ہے تو اس کا سخن جوان ہوتا ہے

نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک ایسی زبان کو رواج دیا جو فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے اس مشترکہ زبان کو خود خسرو نے "ہندوی" کا نام دیا۔ ہندی زبان میں ان کا کلام بے انتہا مقبول ہوا اور ہندوستان کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے یکساں طور پر قابل قبول نیز ذہنی طور پر ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوا۔ فارسی اور ہندوستانی کی آمیزش سے انھوں نے جو کلام تخلیق کیا ہے وہ آج بھی اپنی ادبی اہمیت اور افادیت کے لئے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ امیر خسرو نے خود بھی اپنی ایجاد کردہ ہندوی زبان پر تفخر کا اظہار کیا ہے۔

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب　　شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ذیل میں اُن کی ایک "ہندوی غزل" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خوار شدم زار شدم لٹ گیا　　در غم ہجراں تو کمر ٹوٹ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من　　بے گنہم ساتھ عجب روٹھ ہے
روئے تو رونق شکن آفتاب　　سرو بہ پیش قد تو بوٹ ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ　　وہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹ ہے

اس کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل غزل بھی شاید اسی مناسبت سے اردو کی پہلی غزل کہی گئی ہے کہ اس میں فارسی اور ہندوستانی زبان کے اختلاط سے ایک نئی زبان ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ شاعر موصوف کی یہ غزل ہندوی کا ایک ایسا نادر نمونہ ہے جس نے اس طرز سخن کو سخن سنجو اور سخن فہموں سے ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کروانے میں نمایاں اور منفرد رول ادا کیا ہے۔ اور یہی زبان بعد میں حوادث روزگار سے باہم دست و گریباں ہوتی ہوئی اردو زبان کے نام سے مشہور ہوئی۔ مذکورہ غزل کے چند شعر منقول ہیں ؎

اور ابھی ایاز چونکہ خود جوان ہیں اس لئے ان کی شاعری عبوری دور کی منزلوں میں ہے۔

میری اور ایاز کی ملاقات کا وقفہ بہت مختصر ہے۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں جب پہلی بار لکھنؤ میں میرے مکان پر آئے تو رسمی تعارف کے بعد مجھے ان سے گفتگو کرنے کا تفصیلی موقع ملا۔ میرے دل پر ان کے لئے اولاً صرف یہ نقش قائم ہوا کہ وہ نہایت با اخلاق اور وضعدار قسم کے آدمی ہیں، خلوص و محبت کا ایک پیکر مجسم ۔۔۔۔ اور حسن سیرت کا جیتا جاگتا نمونہ۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت اتنی بہت سی خوبیوں کا مالک ہونا بذات خود ایک کمال ہے اور کسی بھی شخص کی شاعرانہ فراست اور فنکارانہ حیثیت کے اظہار کے لئے ان خصائل کی طرف اشارہ کرنا ہی بہت کافی ہے۔

"اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں" کے مصداق دوسری ملاقات میں ایاز پہلے سے زیادہ ٹوٹ کر ملے، ان کا اخلاق اور خلوص بھی اب پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ اب تکلف کی جگہ بے تکلفی نے لے لی تھی اور رسمیات کے پردے میں چھپے ہوئے ایاز نے اپنے خول سے باہر نکل کر جب اپنا مندرجہ ذیل شعر سنایا تو عقل حیران رہ گئی ؎

شاید اس میں بھی تری کوئی مشیت ہوگی
قطرے آپس میں ملے بھی تو سمندر نہ بنا

کہاں لکھنؤ اور دہلی کی آب زمزم میں ڈھلی ہوئی ٹکسالی زبان۔ کہاں سرزمین بنگالہ کے آغوش میں پروان چڑھنے والا ایک نووارد سخن ۔ لیکن زبان کی شستگی، سلاست اور روانی نے یہ امتیاز ہی پیدا نہ ہونے دیا کہ لکھنؤ اور کلکتہ کے درمیان کتنی بڑی جغرافیائی خلیج حائل ہے۔ سیکڑوں کوس کی مسافت طے کرنے کے باوجود بھی لہجہ میں کوئی تکلف یا کسی قسم کے تکان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے، یہ صرف ٹیگور اور وحشت کی سرزمین

کا خاصہ ہے جو غلام حسین ایاز کی رگ و پے میں سما گیا ہے اور جس نے شاعر مذکور کی شاعرانہ حس پر ایسی تعمیری ضربیں لگائی ہیں کہ ان کے شعور، فکر و احساس کو ایک نئی زندگی ملی ہے اور غالباً اسی احساس جمال سے ایاز کی شاعری کا ازلی رشتہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سادگی کے ساتھ حسن اور احساس لطیف کا فقدان نظر نہیں آتا اور وہ اس عظیم سرمایہ سے یکسر محروم نہیں ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۰ء میں ایاز دوبارہ لکھنؤ آئے۔ آئے تو پہلے ہی والے ایاز، لیکن اپنی شخصیت اور فنی حیثیت میں ایک عدد اضافے کے ساتھ۔ اپنا مجموعۂ کلام "لفظوں کی لکیریں" بغل میں دبا کر۔ گویا کہ " نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب " کی توضیح و تشریح بن کر آئے۔

جس دن سے ان کا مجموعہ کلام میرے ہاتھ آیا ہے، تقریباً ہر روز اس کا جزوی مطالعہ کرتا ہوں لیکن "ہنوز روز اول" ہے۔ صرف چند ابتدائی غزلوں تک ہی میرا مطالعہ محدود ہے اس لئے کہ ابتدا ہی میں کچھ ایسے بلند قامت اشعار سے سابقہ پڑتا ہے جن کی فکری اور معنوی بلندی چھلانگ لگا کر پھاندنا، کم از کم میرے لئے سخت دشوار ہے نتیجتاً چند عمدہ اشعار پر نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں اور مجموعہ کلام کا تفصیلی مطالعہ آئندہ پر موقوف ہو جاتا ہے۔

ایاز کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو خود بخود زباں زد اور حافظہ میں محفوظ ہو جانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے ایسے ہی چند اشعار سنا کر " نیاز مندان ایاز" کے ذوق سامعہ کو " سامان خورد و نوش " فراہم کرنا میرا مقصد ہے۔ ایاز کی شخصیت اور فن کے بارے میں اب بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان کی شخصیت اور شاعری پر کافی مواد موجود ہے، لیکن انھیں اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے ان پر کچھ لکھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ انھیں بخوبی سمجھا جائے اور اس کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا جائے اس لئے کہ

شاعر کا کلام ہی دراصل اس کی شعری زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ چند اشعار سے ان کی شاعری کے طرز اور آہنگ کے بارے میں ایک واضح خاکہ بن جائے گا۔ اشعار درج ذیل ہیں ؎

لوگ پتھر لئے چلتے ہیں یہاں ہاتھوں میں
دیکھ اس شہر میں شیشے کا کوئی گھر نہ بنا

میرے وجود کا ہر نکتہ فلسفہ بنتا
تری نگاہ نہ پڑتی تو میں خدا بنتا

شعور فکر کی دیوار ہم اٹھا کے چلے
اصول و فن کے نئے زاویئے بنا کے چلے

کسی بھی حال میں تنہا نہ جی سکے ہم لوگ
چلے جدھر سے بھی اک قافلہ بنا کے چلے

میں اُنکی ذات میں ہوتا تو بے نشاں ہوتا
وہ میری ذات میں آتا تو اک صدا ہوتا

قدموں کے نشاں دور تک چھوڑتے چلئے
گزریں گے ابھی لوگ اسی راہ گزر سے

میں نے شیشے کی طرف آنکھ اٹھائی تو ایاز
میرا عجلسا ہوا چہرہ نظر آیا مجھ کو

مانگ بڑھ جائے گی بازار کی دوکانوں میں
شرط یہ ہے کہ ذرا اپنے کو سستا کر لو

ہر شخص اپنے خول کے اندر خدا لگے
یہ تیرا شہر آج بھی حیرت کدہ لگے

دوسرا

حصّہ

عربی زبان کا مطالعہ ضروری ہے

عربی زبان کا مطالعہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اس کی موجودہ زمانے میں بین الاقوامی اہمیت ہے بلکہ اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ پچھلی کئی صدیوں کے دوران ہندوستان اور عرب کے اسکالر ایک دوسرے کے ادب میں گہری دلچسپی لیتے آئے ہیں ہندوستانیوں اور عربوں کے تعلقات پر اگر غور کیا جائے تو اس کا سلسلہ زمانۂ ماقبل اسلام سے ملتا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں ہندوستان کے بہت سے ریاضی داں اور معالجین بغداد مدعو کئے گئے اور وہاں ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں خوب نوازا گیا۔ بغداد اور ہندوستان کے تعلقات خلیفہ المامون کی حکومت کے دوران مزید مضبوط اور مستحکم ہوگئے۔ اس خلیفہ نے اپنے "دارالحکمت" میں تحقیقی کام کے لئے دنیا کے متعدد ممالک سے ذہین لوگوں کو جمع کیا تھا۔ ریاضی، علم نجوم اور علم الادویات کے موضوع پر سنسکرت زبان میں تیار کئے گئے بہت سے شاہکاروں کا عربی ترجمہ بغداد ہی میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ بعد کو انھیں عربی کتابوں نے یورپ کا رخ اختیار کیا۔

عربی لٹریچر بلا مبالغہ بہت وسیع اور جدید دور کے دانشوروں کے لئے علم کا ایک گنج گرانمایہ ہے۔ ابن مقفع کی کتاب "کلیلہ ودمنہ" عربی ادب کی مشہور ترین تصنیفات میں شمار ہوتی ہے۔ جو اصلاً سنسکرت کے مشہور فلسفی "بدابا" (BIDABA) کی تصنیف ہے۔ ہندوستانی پنچ تنتر سے متعلق یہ کتاب عربی زبان

میں منتقل ہو کر بہت مقبول ہوئی۔ اس میں سیاست کو موضوع بنا کر جانوروں اور پرندوں کی زبانی سیاسی فلسفہ پر لطیف انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف کو اپنے سیاسی نظریات کے اظہار پر قابل سزا قرار دیا گیا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب "تحریر و تقریر کی آزادی" نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں تھا۔

ابن بطوطہ

عرب سیاح ابن بطوطہ (۱۳۰۴ — ۱۳۷۸ء) نے ہندوستان کا تفصیلی سفر کر کے یہاں کے سیاسی اور تہذیبی حالات کو عربی ادب کے قیمتی سرمایہ میں شامل کر دیا اس کی عربی کتاب دور گزشتہ کے مورخین سے رابطہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ابن بطوطہ کے بعد ایک دوسرے مغربی ایشائی سیاح البیرونی (۹۷۳ — ۱۰۴۸ء) نے ہندوستان کا سفر کیا اور اس نے بھی ہندوستانی عوام سے متعلق ایک زبردست کارنامہ یادگار کے طور پر چھوڑا ہے ہندوستان آنے والے ان عظیم دانشوروں نے سنسکرت زبان کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور اس سے مستفید ہوئے۔ بالکل اسی طرح ہندوستانی ادباء نے عربی زبان کو بھی گلے لگایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج یہ دونوں زبانیں دنیا کی عظیم زبانوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

مطالعہ — وہ عربی زبان کا ہو، سنسکرت یا دنیا کی کسی زبان کا — قوموں کے باہمی تعلقات کو فروغ پہونچانے میں معاون ہوتا ہے اور عالمی امن کے قیام میں تحریری تبادلۂ خیالات کے ذریعہ ساری دنیا کو فائدہ پہونچایا جاسکتا ہے۔

موجودہ دور میں عربی زبان و ادب کی تعلیمات عرب دنیا سے مزید دوستانہ تعلقات بڑھانے میں مفید اور کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ ابھی حال میں ہندوستانی عوام نے سامراجی قوتوں کے خلاف عربوں کی جدوجہد میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا تھا۔ ہمارے ملک کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے

ہمیشہ عربوں کے حوصلہ کی حمایت کی اور مصیبت کے اوقات میں ان کی ہر قسم کی اخلاقی و مادّی امداد بھی کرتے رہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں قائم موجودہ حکومت بھی عرب دوستی کی روایتی پالیسی پر برابر عمل درآمد کر رہی ہے۔

منارۂ امن

ایشیا کا تابناک مستقبل ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان دوستانہ تعلقات پر منحصر ہے۔ اگر جنوب مشرقی ایشیائی ممالک، عرب ممالک اور ہندوستان آپس میں متحد ہو کر ایک دوسرے کو قریب لانے اور دوستی کو مزید مستحکم کرنے کا تہیہ کر لیں تو یقیناً ایشیا "منارۂ امن" بن سکتا ہے۔ عرب دنیا کو قریب لانے کے بعد ہی ایشیا دنیا میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کر سکتا ہے۔

اس آرٹ کو اپنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم خلوص دل، نیک نیتی اور سخت محنت کے ساتھ عربی زبان و ادب کو گلے سے لگائیں اور ان لوگوں میں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے کا جذبہ پیدا کریں۔ اس طرح سے باہمی اتحاد اور طاقت کو دوامی شکل دی جا سکتی ہے۔

تمدّن ایران کا جائزہ

ای خاک مقدس که بود نام تو ایران

فاسد بود آن خون که براہ تو نریزد

سولہ لاکھ پینتالیس ہزار مربع کیلومیٹر زمین پر بسنے والی ساڑھے تین کروڑ کی آدی آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے ان سرخ رو انسانوں کی ہے جو مذکورہ شعر کی روشنی میں اپنے وطن ایران کے لئے زندہ ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کا خون اپنے وطن عزیز کے لئے نہ بہا ہو وہ خون فاسد ہے غرضکہ وہ جس وطن میں زندہ رہ کر اپنی زندگی کا حق ادا کر رہے ہیں اس کے مفاد میں اپنی جان دے دینا بھی ایک خوشگوار فریضہ تصور کرتے ہیں۔

ایران اپنی زمین (سولہ لاکھ پینتالیس ہزار مربع کیلومیٹر) کے اعتبار سے فرانس، جرمنی، انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک وغیرہ سے مماثلت رکھتا ہے جسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ پر آبادی ہے۔ دوسرا صحرائی علاقہ ہے اور تیسرے پر جنگلات اور پہاڑوں کا راج ہے۔ اگر ایران کی جغرافیائی حد بندی کی جائے تو حسب ذیل ہوگی۔ مشرقی سرحد بلوچستان (پاکستان) اور افغانستان کے ریگ زاروں سے ملحق نیز ہل منڈ "مند" اور "ہری رود" دریاؤں کے قریب ہے۔ شمالی ایران کو "تیجن" دریا اور ایک پہاڑی سلسلہ ترکستان کے میدانی علاقے سے الگ کرتا ہے۔ دریائے اترک اور بحر مازندرانی کے علاوہ "استرا" اور "ارس" نام کے دریا بھی روس ایران

ز حالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل، دو چشم جادو، بصد فریبم، ببرد تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو،
سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

کلامِ خسرو میں خالص ہندوستانی طرزِ فکر کے علاوہ ایک ایسی موہنی اور عام فہم زبان بھی ملتی ہے۔ جو ان کی ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت کی شاہد اور ضامن ہے۔ اسی زبان کی بدولت خسرو نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں قومی اور عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت اور انفرادیت حاصل کی۔ اور اسی زبان کے سہارے ہندوستانی عوام کو اپنا گرویدہ بنانے میں اظہارِ کمال کیا۔ ذیل میں خسرو کی ایک رباعی نقل ہے جس میں انھوں نے اپنے وطن کی ایک دہی بیچنے والی عورت کو تخلیق کا موضوع بنایا ہے ؎

سرحد کے قریب موجود ہیں۔ شمال مغرب میں ترکی۔ مغرب میں عراق اور خلیج فارس واقع ہیں۔ جنوبی ایران خلیج فارس اور بحر عمان کی حدبندیوں سے جکڑا ہوا ہے۔

ایرانیوں کا خیال ہے کہ ایران میں ہی دنیا کی پہلی شہنشاہت قائم ہوئی تھی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اس کی ابتدائی تاریخ تو کوائف زمانہ کی نذر ہو گئی یہ حالات اب صرف اسانیہ میں باقی رہ گئے ہیں البتہ ڈھائی ہزار سال کی جامعہ تاریخ اب بھی موجود ہے۔ جب کورش کبیر (CYRUS THE GREAT) نے سرزمین ایران پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ داریوش اعظم نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر اسے استحکام بخشا اور اس کے بعد کے ہخامنشی حکمرانوں نے اپنے اسلاف کے جلائے ہوئے چراغ کو حالات کی آندھیوں سے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اس کی روشنی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہخامنشی اشکانی ساسانی طاہری صفاری، سامانی، غزنوی، سلجوقی، مغل تیموری، صفوی اور قاچاری بادشاہوں اور حاکموں نے تقریباً تین ہزار برس تک ایران پر حکمرانی کی۔ سولہویں صدی عیسوی میں صفوی دور حکومت کے زمانے میں ایران کا سرکاری مذہب "شیعت" قرار پایا جو اب تک برقرار ہے۔

سمندر کی سطح سے اوسطاً چار ہزار فٹ کی بلندی پر ایران واقع ہوا ہے۔ سارے آباد علاقہ کی سطح تقریباً ایک ہی ہے۔ خلیج فارس اور بحر خزر جیسے آبی خزانوں کے ساتھ یہ ملک پہاڑوں کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ ایران کا سب سے اونچا یہ پہاڑ دماوند اٹھارہ ہزار نو سو فیٹ (۱۸۹۰۰) بلند ہے۔

آذربائیجان، مازندران، فارس اور دوسرے صوبوں میں اس کی تیرہ ہزار فیٹ سے پندرہ ہزار پانچسو فیٹ بلند چوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ ایران کے زیادہ تر شہر سطح سمندر سے چار ہزار فیٹ کی بلندی تک واقع ہیں لیکن بعض بعض شہر سمندر کی سطح سے صرف پچاس فیٹ کی بلندی ہی پر بسے ہیں جو اپنی روایتی آب و تاب میں اضافہ کا سبب بن گئے ہیں۔

ایران کے خاص خاص دریاؤں میں جنوب و مغرب میں بہنے والا دریائے کارون جس کے کنارے قدیم ایرانی تہذیب نے جنم لیا، بہت اہم ہے۔ اس دریا سے صوبۂ خوزستان کی آبپاشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کا پانی سارے صوبے کی کاشت کاری کو فروغ پہونچانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا مشہور دریا "سفید رود" ہے جس کا منبع کردستان کے پہاڑوں میں ہے اور یہ پہاڑی پیٹیوں سے گزرتی ہوئی بحر خذر میں جا گرتا ہے "دریائے ہرز" کوہ دماوند کے ڈھلانوں سے جاری ہوا ہے اور بحر مازندران میں جاکر ختم ہو جاتا ہے۔

"زاینده رود" ایک مقامی دریا ہے جو سمندر کی سطح سے تقریباً پانچ ہزار فیٹ کی بلندی پر وسط ایران میں رواں ہے۔ اور آخر میں دلدل میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ایران میں سال میں چار موسم ہوتے ہیں اور ہر موسم کے تین مہینے۔ بہار، تابستان، پائیز (خزاں) اور زمستان — (۱) بہار کا موسم عیسوی سال کی ۲۱ر مارچ سے شروع ہوتا ہے اور ۲۰ر جون تک رہتا ہے۔ اس موسم میں تین مہینے فروردین، اردی بہشت اور خرداد ہوتے ہیں۔ ۲۱ر جون سے ۲۰ر ستمبر تک تابستان کا موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں تیر، مرداد اور شہریور تین مہینے ہوتے ہیں۔ پائیز یعنی خزاں کا موسم مہر، آبان اور آذر تین مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی مدت سن عیسوی کے اعتبار سے ۲۱ر ستمبر سے لے کر ۲۰ر دسمبر تک ہوتی ہے۔ سردی کے موسم کو زمستان کہتے ہیں جس کی مدت ۲۱ر دسمبر سے ۲۰ر مارچ تک ہوتی ہے۔ دی، بہمن اور اسفند سردی کے مہینے ہیں۔ ان مہینوں میں ایران میں زوردار سردی پڑتی ہے اور مسلسل برف باری ہوتی رہتی ہے۔ اس موسم کے علاوہ ہمیشہ خوشگوار موسم رہتا ہے۔ میدانی علاقوں کا موسم ہمیشہ خشک اور خنک ہوتا ہے۔ پہاڑی وادیوں میں قوت بخش اور نزاکت پرور ہوائیں چلتی ہیں۔

شمالی مغربی علاقہ اور اس کے بالائی حصّہ میں جاڑے کے زمانے میں بڑا سخت اور ناقابل برداشت موسم ہوتا ہے۔

بحر خزر (CASPIAN SEA) دنیا کی سب سے بڑی جھیل ہے جو ایران کی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے تقریباً سو فیٹ نیچے ہے۔ اس کے علاوہ "رضائیہ جھیل" ہے جس کا رقبہ ڈھائی ہزار مربع کیلو میٹر کے لگ بھگ ہے۔ یہ جھیل مغربی آذربائیجان میں ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو کیلو میٹر لمبی اور تیس کیلو میٹر چوڑی یہ جھیل نمکین پانی کی آماجگاہ ہے اور اس سے نمک بنانے والی ایرانی صنعت کو کافی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ "نمرین جھیل" سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر صوبۂ فارس میں واقع ہوئی ہے۔ مذکورہ جھیلیں حسن قدرت کے مظاہر اور انسانی ضروریات کی تکمیل کرنے والوں کی بصیرت اور بصارت دونوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ایران کے قدرتی وسائل اور پیداوار کا جائزہ لیتے وقت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا قدرتی وسیلہ تیل ہے۔ اس لئے کہ ایران دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ممالک میں چوتھے نمبر پر شمار ہوتا ہے اور اس کے بعد زمینی اور کارخانجاتی پیداوار میں گیہوں، جَو، چاول، تمباکو، چائے کھجور، کپاس اور شکر وغیرہ شامل ہیں۔ ایران کے پہاڑی علاقے کار آمد لوہے، تانبے، جستے، نمک، کردسیم، نکل، چمکیلے پتھر، سیسہ، المونیم، سرمہ بنانے کے پتھر، فیروزے، پھٹکری، پلاسٹر آف پیرس بنانے کی کھریا مٹی اور پوٹاشیم بائی کاربونیٹ کے خزانوں سے مالا مال ہیں۔ قدرت کے بخشے ہوئے اس بیش بہا خزانے کے علاوہ ایران میں ایک نیا صنعتی نظام بھی قائم ہو رہا ہے۔ یہ نظام گو کہ ابھی نومولود ہے لیکن اس کی جڑیں صنعتی میدان میں کافی دور تک پھیل چکی ہیں۔ ٹیکسٹائل، سیمنٹ، کپاس، سگریٹ، شکر، تانبہ، قالین سازی، مچھلیوں کی نگہداشت نقل

حمل کے لئے غیر ملکی پرزوں کی مدد سے گاڑیوں کی تیاری اور تیل پیدا نیز صاف کرنے کی صنعتیں نہ صرف ایران میں قائم ہو چکی ہیں بلکہ روز افزوں ترقی کرنے کی منزلوں میں ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صنعتی میدان میں تیل برآمد کرنے اور اسے صاف کرنے کے بعد مختلف قسم کی مصنوعات تیار کر کے عالمی منڈی میں ایران نے اپنی دھاک جمالی ہے۔ آبادان میں تیل صاف کرنے کا ایرانی کارخانہ دنیا کے تیل صاف کرنے والے کارخانوں میں سرفہرست ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اس ریفائنری کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ابتدا میں غیر ملکی ماہرین کی مدد سے یہ کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اب اس کا پورا عملہ ایرانی تکنیکی ماہرین پر مشتمل ہے۔ تیل کی صنعت اور مذکورہ کارخانہ کے بارے میں تفصیلی معلومات بعد میں پیش کی جائیں گی۔ اس صنعت کے علاوہ دوسرے صنعتی شعبوں میں ایران برابر پیش قدمی کر رہا ہے۔ تجارت کے معاملے میں بھی وہ دوسرے مغربی ایشیائی ممالک سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ وہ دنیا کے دوسرے ممالک کو اُون، کپاس، خشک میوے، کھالین، چمڑا، قالین، خام دھات، کوئلہ اور تیل سے تیار شدہ دوسری مصنوعات برآمد کر رہا ہے جس کی وجہ سے اچھا خاصا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے عوض حسب ضرورت دوست ممالک سے کھانے پینے کے سامان کے علاوہ کچھ دوسری چیزیں درآمد بھی کرتا ہے۔ جس میں مشینری، فالتو پرزے، آٹو موبائل انڈسٹریل کا سامان، ٹرانسپورٹ کے اوزار، دوائیں، کیمیکل کی مصنوعات، سرجری کے اوزار، موٹر ٹائر، کپڑا، دھاگہ، شکر اور چائے وغیرہ شامل ہیں۔

ایران کا خاص سکہ، ریال ہے۔ لیکن سعودی یا عمانی ریال کے مقابلہ میں اس کی قدر بہت کم ہوتی ہے۔ ایرانی تومان دس ریال کے برابر ہوتا ہے اور نسبتاً بڑا سکہ ہے لیکن سرکاری اور عوامی طور پر ریال ہی کو قومی سکہ کی حیثیت

حاصل ہے۔

خوش حالی، ترقی اور خود کفالت کے میدان میں برق رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کرنے والے دنیا کے چند ممالک ہیں ایران کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ایرانی قوم اپنے رہن سہن اور معیار زندگی بنانے کے ساتھ ساتھ مستقبل کو زیادہ روشن اور تابناک بنانے کے لئے ہمہ جہتی طور پر کوشاں ہے اور اس سلسلہ میں وہ ہر شعبۂ زندگی میں حتی المقدور اپنی لیاقت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

ایران کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ انقلابات سے بھری ہوئی ہے۔ طرح طرح کے تغیر و تبدل کے باوجود اس قوم نے اپنے اسلاف کی بنائی ہوئی روش کو نہ چھوڑا اور آج بھی مغربیت کے دبیز پردے کے پیچھے سے مشرقیت صاف جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اخلاق و آداب

جدید ایران مغربی طرز زندگی سے متاثر ہے لیکن اس کا انداز فکر خالص مشرقی ہے۔ رہن سہن، پوشاک، وضع قطع اور خورد و نوش کے سلسلہ میں برتے جانے والے تکلفات کے اعتبار سے یورپ اور ایران کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن مذہب، تہذیب، تمدن، ثقافت، ادب اور زبان کے معاملہ میں اس کی ایک انفرادیت ہے جو خالص مشرقی معاشرت کہی جا سکتی ہے۔ اخلاق و آداب اور مہمان نوازی کے معاملہ میں ایران کے لوگ ہندوستانی بلکہ لکھنوی تہذیب سے قریب تر ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کے قدیم تہذیبی مراکز مثلاً رامپور، حیدرآباد، بھوپال، دہلی اور فیض آباد وغیرہ ایرانی تہذیب و تمدن اور تعریفات و تشریفات سے بے حد متاثر ہیں۔ لکھنؤ کی "پہلے آپ" شاید ایران ہی سے مراجعت

کرکے یہاں آئی ہے ۔ اور ان شہروں کی روزمرّہ کی زندگی میں ایسے جملوں اور فقروں کی کمی نہیں ہے ۔ جن میں بے انتہا تکلّف اور تصنع کا شائبہ نظر آتا ہے ۔ معمولی حرکات پر " دست شما درد نکنید " ۔ " چشم تو روشن دل ما شاد " کے مخفف کے طور پر صرف " چشم " اور تکلّفات کے اظہار کے لئے ۔ " خواہش میکنم " اور " بفرمائید " جیسے جملے ہر وقت کانوں میں گونجتے رہتے ہیں اور یہ جملے اس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں کہ بسا اوقات ان کے معانی اور مفاہیم پر شک ہونے لگتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس قسم کے جملے اور فقرے وقت اور موقع کے لحاظ سے سینکڑوں معنی میں استعمال ہوتے ہیں ۔ محل استعمال کی مناسبت سے اس کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ " چرا " اور " خواہش میکنم " جیسے الفاظ بیک وقت مثبت اور نفی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ۔

زبان

اپنی روزمرہ کی زبان کے معاملہ میں ایرانی بہت ترقی پسند ہیں ۔ دوسری زبانوں کے کارآمد الفاظ اور محاوروں کو معرّب کرنے کے سلسلہ میں ایران میں بڑی باقاعدگی سے کام ہو رہا ہے ۔ " لغت نامہ دہخدا " کی جلدیں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں جن کے ذریعہ نئے نئے الفاظ اور محاورے فارسی زبان میں شامل کئے جا رہے ہیں اور اس زبان کے خزانے میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے ۔ بہت سے فرانسیسی اور انگریزی الفاظ اب فارسی لغات میں مستقل جگہ پا چکے ہیں اور ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے ۔ موجودہ بول چال کی فارسی فرانسیسی تلفظ سے بہت متاثر ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم اور جدید فارسی میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ لکھنے اور پڑھنے کی زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ و محاورات فارسی تلفظ کے ساتھ اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں مثلاً تلگراف ، تلفن ، ناسیونال اور مدراسیون ، انگریزی الفاظ ٹیلیگراف

ٹیلیفون نیشنل اور فیڈریشن وغیرہ میں جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اب جدید فارسی زبان کا جزو بن چکے ہیں لیکن ایسے الفاظ کی شمولیت سے اس زبان میں اجنبیت کے بجائے ایک قسم کی جاذبیت اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کی کوئی زندہ اور ترقی پسند زبان ہو، اس کی ترقی اور توسیع کے لئے دوسری زبانوں کے الفاظ و محاورات کو اپنے دامن میں جگہ دینا ضروری ہے، اس قسم کی وسیع النظری سے الفاظ کے خزانے میں یقیناً بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ علمی، ادبی اور کتابی زبان میں اس قسم کی تبدیلیاں اور اضافے خوش آئند ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن روزمرہ بول چال کی زبان اور تلفظ میں مسلسل ردّ و بدل کی وجہ سے زبان کی ہیئت اور وضع قطع ہی بدل جاتی ہے۔ حالانکہ عمل اور اس کا ردِ عمل ناگزیر ہے۔ اسی کو زبان کا نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے اور اسی کی بدولت زبان کو حیات جاوید حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا فارسی میں لفظ" نون" سے پہلے آنے والے" الف" یا" او" " پیش" کی آواز میں تبدیل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے" ایشان" سے" ایشُن"۔ خیابان" سے خیابُن اور" زبان" سے" زبُن" بن کر سینکڑوں الفاظ اب جدید فارسی تلفظ کے قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ اسی طرح لفظ" قاف"، موجودہ فارسی میں" غاف"، کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قوم کو" غوم" قیمت کو" غیمت" مقالہ کو" مغالہ" اور صادق کو" صادغ" تلفظ کرنا ایرانیوں کے لئے عام ہے۔ بعض شمالی علاقوں میں لفظ" کاف" کی جگہ" چ" کا استعمال ہوتا ہے۔ کشمش کو" چشمش" اور کوکاکولا کو" چوچاچولا" سننا کبھی کبھی سماعت پر سخت بار گزرتا ہے اور کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے ایک حد تک مضحکہ خیز بھی ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے آخر میں آنے والا" ہ" موجودہ تلفظ کے اعتبار سے" ے" کی آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سب سے معتبر تلفظ اصفہان اور خراسان کا ہے جہاں آج بھی قدیم فارسی کا رواج عام ہے۔ ایران میں فارسی زبان کے

رواج اور چلن سے متعلق خانم بدری آقابابائی نے ایک ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ ایران کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبان ایک ہی ہے لیکن اس میں علاقائی اور جغرافیائی اعتبار سے جو فرق ہے وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کے درمیان نقل و حمل کی سہولتیں پیدا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس سے عوام کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم ہونے میں مدد ملے گی اور مختلف علاقوں تک وہ زبان پہونچ سکے گی۔ جو اصل فارسی تلفظ کے ساتھ اب بھی ایران کے بعض علاقوں میں بولی، سنی اور سمجھی جاتی ہے۔

پوشاک

امریکہ، برطانیہ اور فرانس اور دوسرے یورپی ممالک کی طرح ایران میں بھی مرد عام طور پر سوٹ اور ہیٹ میں نظر آتے ہیں اور عورتیں اسکرٹ، بیل باٹم، پتلون، منی شرٹ اور بنیائن وغیرہ زیب تن کرتی ہیں۔ لیکن بعض خطوں میں مردوں کو ہیٹ کی جگہ گول ٹوپی کا استعمال کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ شیراز اور اس کے اطراف کی عورتیں وہاں کا روایتی لباس پہنتی ہیں جو ہندوستانی لہنگے اور کرتے سے مماثلت رکھتا ہے۔ اسی طرح مشہد اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی عورتیں شلوار نما پاجامہ اور لمبے کرتے میں ملبوس دکھائی دیتی ہیں۔ مجتہدین کی پوشاک البتہ وہی ہے جو ایران اور عراق سے ہندوستان تک رائج ہے۔

خوراک

غذا اور خوراک کے معاملہ میں ایران میں بڑا ضبط و نظم ہے اور اس امر پر وہاں کی حکومت سخت نگاہ بھی رکھتی ہے کہ کھانے کے داموں میں بہر حال کنٹرول رکھا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کا کوئی بڑے سے بڑا شہر ہو یا چھوٹے سے

چھوٹا قصبہ لیکن ہر جگہ کھانے کے دام یکساں ہیں۔

"نان بربری" "نان سنگکی" اور "نان شیرین" وغیرہ جیسی قدآدم روٹیاں چند سکّوں کے عوض ہر جگہ دستیاب ہیں جن سے بیک وقت کئی آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ ایران میں عمدہ چاول کی افراط ہے جس کی وجہ سے وہاں کی مخصوص اور مرغوب غذا "چلوکباب" ہے، جسے عام طور پر لوگ پسند کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ ہمبرگر، دمپی، جوجہ کباب اور مرغ اور گوشت سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں ہر کھانے کے ہوٹل میں ہر وقت تیار ملتی ہیں۔ جنھیں اس قسم کی دوکانوں میں آویزاں فہرستوں میں دیکھ کر اور ان کی قیمت ادا کرنے کے بعد ٹوکن خرید کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایران کے مختلف شہروں کے ہوٹل عام طور پر "دست خود دہان خود" کے نقیب ہیں۔ اسی لئے کھانے کے ہوٹلوں میں بیرے یا سرو کس کرنے والے افراد نظر نہیں آتے بلکہ ایسے تمام ہوٹل "سلف سرو کس" کے اصول پر قائم ہیں۔

مذہب

تقریباً پانچ سو سال سے ایران کا سرکاری مذہب "شیعت" ہے اور کل آبادی کا نوے پچانوے فیصد طبقہ اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پانچ سے لے کر دس فیصد تک اقلیتی فرقے ہیں جن میں یہودی، عیسائی، آرمینی اور سُنی مسلمان وغیرہ شامل ہیں۔ گویا کہ شیعہ فرقہ ایران میں سب سے بڑی مذہبی اکثریت ہے اور دوسرے مذاہب سے متعلق اقلیتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمام اقلیتوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ کوئی ایک دوسرے کے مذہبی فرائض میں مداخلت نہیں کرتا۔ حکومت نے بھی ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کو عبادت اور ریاضت کے لئے سہولتیں دے رکھی ہیں۔ لیکن بہائی فرقہ کے خلاف ایرانیوں میں بیزاری اور نفرت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ

غور ہے کہ کسی قسم کی عبادت یا مذہبی فرائض کی ادائیگی صرف گھروں اور عبادت گاہوں کے حدود کے اندر ہی ممکن ہے۔ سڑک، شارع عام یا کسی عوامی جگہ پر ہر قسم کے جلسہ جلوس اور مذہبی سرگرمیوں پر سخت پابندی ہے۔ حالانکہ ایران میں تعزیہ داری، علم برداری اور ماتم وغیرہ رائج نہیں ہیں۔ صرف مجلسوں میں عزاداری کا رواج ہے البتہ ایک بار روضۂ امام رضا (مشہد) پر ہمارے ساتھیوں نے چند لوگوں کو ہندوستانی بلکہ لکھنوی طرز کا ماتم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو ایرانی ماحول کے لحاظ سے ہم لوگوں کے لئے یقیناً بالکل نئی چیز تھا۔ ایران میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام ہشتم کی تصویریں اس قدر ارزاں اور عام ہیں کہ تقریباً ہر گھر، دوکان اور دفتر میں نظر آتی ہیں۔ حضرت علیؑ کی تصویر کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ موجودہ شہنشاہ ایران آریہ مہر محمد رضا شاہ پہلوی کو اپنے سفر یورپ کے دوران ڈنمارک یا پولینڈ کے کسی میوزیم میں یہ تصویر دیکھنے کو ملی تھی جسے انھوں نے ایران میں لاکر اپنے عوام کو تحفہ کے طور پر نذر کر دیا جب سے اس تصویر کی مسلسل نقلیں ہو رہی ہیں اور اب اس کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کلنڈروں اور کنجی کے چھلّوں سے لے کر تزئین و آرائش کے دوسرے سامانوں پر چھپی ہوئی ملتی ہے۔ اس تصویر سے وہاں کے عوام کو بڑی عقیدت اور محبت ہے۔ مذہبی عقیدت اور شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ عبادت گاہوں اور زیارت گاہوں کی تصویریں کھینچنا قطعاً منع ہے اور ان کے احاطوں میں بغیر پردہ عورتوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ عبادت گاہوں اور زیارت گاہوں کی تصویر اتارنے کی ممانعت اور پیغمبر اور اماموں کی تصویروں سے والہانہ محبت۔ گو کہ دونوں کلیتاً متضاد مسئلے ہیں لیکن انھیں مذہبی شیفتگی اور والہانہ عقیدت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال ایرانی عوام میں سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہب سے وابستہ ہیں، وہ مذہبی معاملات میں بہت سخت اکھڑ اور بے لچک ہیں۔ ان کے برعکس جن لوگوں کا رجحان مذہبی نہیں ہے۔ وہ مغربی

گجری کہ تو در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو لبت قند شکری ریزد
ہر گاہ بگوی کہ " دہی لیہو دہی"

"اللہ جمیل و یحب الجمال"۔ یعنی اللہ حسین اور حسن پسند ہے۔ اگر واقعی یہ سچ ہے تو خسرو بھی انھیں حسینوں میں شامل ہیں جو اللہ تعالےٰ کو محبوب و مرغوب ہیں ۔ وہ صوفیانہ طبیعت کے مالک تھے اس لئے ہر چیز کے حسن و قبح پر ان کی نظر رہتی تھی ۔ وہ حسن کے شیدائی اور متوالے تھے ۔ انھیں حسن و جمال کی جھلک جہاں کہیں نظر آجائے۔ اس پر فریفتہ ہو جائیں ۔ اپنی حسن پرستی کو انتہائے کمال پر پہونچانے میں ان کی فکر کے علاوہ سلاست زبان اور اسلوب نگارش کو بھی بڑا دخل ہے ۔ ذیل کے شعر میں وہ خود اپنے حسن کی طرف مائل نظر آتے ہیں ؎

نے گلم ، نے بلبلم ، نے شمع ، نے پروانہ ام
عاشق حسن خودم بر حسن خود دیوانہ ام

جس طرح خسرو اپنے حسن پر فریفتہ ہیں ۔ دوسروں کے حسن پر بھی ان کی نظر اتنی ہی صحیح پڑتی ہے ۔ دراصل دوسروں کے حسن سے قطع نظر کر کے جب کوئی شخص اپنی ذات میں محدود ہو جائے جب ہی اسے اپنی ہستی میں حقیقی حسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

انداز کی الف لیلوی زندگی گزار رہے ہیں۔

سماجی رسوم

خوشی اور غمی زندگی کے دو عظیم محرکات ہیں، ان کا وجود کبھی دنیا کی ہر جگہ پر مسلّم ہے لیکن ان کے اظہار کے طریقے ہر جگہ اپنے رسوم و رواج کے مطابق ہوتے ہیں۔ خوشی اور غمی کے سب سے بڑے اور اہم واردات شادی اور موت کے موقع ہیں۔ ایران میں ان رسوم کی ادائیگی کے لئے اپنی کچھ روایات ہیں۔ عام طور پر نامزدگی (منگنی) کے وقت لڑکوں کی عمر اٹھارہ بیس سال اور لڑکیوں کی پندرہ سولہ سال کی ہوتی ہیں۔ نامزدگی اور شادی کے درمیان تقریباً تین ماہ کا وقفہ ہوتا ہے اس وقفہ کے دوران نامزد دولہا اور دلہن ہر ہفتہ تعطیل کے روز آپس میں مل کر ایک دوسرے کے عادات و اطوار سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر تعطیل کو نامزد دولہا اپنی منگیتر کو اپنے ساتھ سیر و تفریح کے لئے لے جانے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور اس طرح شادی سے پہلے ہی دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ شادی کی تقریبات عام طور پر لوگوں کے گھروں پر منعقد نہیں ہوتیں بلکہ اس مقصد کے لئے ایران کے ہر شہر میں ریستوران نما بڑے بڑے ہال موجود ہیں جہاں کشادہ اور سجی سجائی جگہ کے علاوہ مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے بھی اعلیٰ قسم کے انتظامات بآسانی ہو جاتے ہیں۔ شادی کے موقع پر عام طور سے دولہا سوٹ، ٹائی اور ہیٹ میں ملبوس ہوتا ہے اور دلہن کو ایک مخصوص عروسی لباس پہنایا جاتا ہے۔ یہ لباس سفید رنگ کا ہوتا ہے اور یورپی دلہنوں کے لباس کی طرح بنا ہوتا ہے۔ ایرانیوں کی شادی میں "مہر" کی رقم چار، پانچ لاکھ تومان تک مقرر ہوتی ہے جس کی ادائیگی عام آدمی کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں خوشی مہنگی اور غمی سستی ہے۔ ایران میں کسی کی وفات ہو جانے پر

متعلقین کو صرف ایک مخصوص ٹیلیفون نمبر پر اطلاع کر دینا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سرکاری عملہ آکر تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات مکمل کرتا ہے اور نعش کو ایک بکس میں رکھ کر بکس کے اوپر مرحوم کی تصویر آویزاں کر دیتا ہے پھر سرکاری گاڑی کے ذریعہ نعش تدفین کے لئے لے جائی جاتی ہے۔ ان سارے رسوم میں مرحوم کے اعزّا اور متعلقین بھی غیروں کی طرح شریک رہتے ہیں۔ ملک کی مختلف زیارت گاہوں اور عبادت گاہوں میں مرحومین کی روح کو ایصال ثواب پہونچانے کے لئے مجلسیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ایسی مجالس کے موقع پر بھی مرحوم کی تصویر سامنے رکھی رہتی ہے اور مجلس کے خاتمہ پر جس طرح یہاں تبرک تقسیم ہوتا ہے اسی طرز پر وہاں حاضرین کو پر تکلف " ایٹ ہوم " دیا جاتا ہے۔

مستعدی

ایرانی اپنے کام کے سلسلہ میں بہت پر خلوص، مستعد اور وقت کے پابند ہیں۔ سرکاری یا نجی زمرے کے دفتروں، کارخانوں اور اداروں میں کام کرنے والے نجی تجارت اور دوسرے پیشوں سے متعلق لوگ اپنے فرائض انجام دینے میں پوری طرح منہمک ہیں۔ ایران کی عوامی زندگی عام طور پر صبح کو سات بجے شروع ہو جاتی ہے جس کا سلسلہ ایک بجے دن تک جاری رہتا ہے ایک بجے دن سے چار بجے سہ پہر تک آرام کا وقفہ ہوتا ہے اس وقفہ میں عام طور سے ہر طبقہ کے لوگ کھانا کھا کر آرام کرتے ہیں۔ چار بجے شام سے نو بجے رات تک ایران اپنے شباب پر ہوتا ہے۔

مشغلے

ہفتہ بھر کی سخت محنت اور مستعد کارگزاری کے بعد تعطیل جمعہ کو ہوتی ہے عام طور پر لوگ اپنے گھروں سے ضرورت کا سامان لے کر خاندان کے دوسرے افراد

کے ساتھ پکنک یا آؤٹنگ کے لئے دور دراز کے علاقوں میں نکل جاتے ہیں اور دنیا کی تمام گہما گہمی سے دور تعطیل کا دن نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ گزارتے ہیں مختلف شہروں کے پارک تعطیل کے دنوں میں نہایت مصروف رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے خاص خاص علاقوں میں عوام کا میلہ لگا ہوتا ہے۔ سینما، اوپیرا تھیٹر اور دوسرے تفریحی مراکز میں بھی ایک ناقابل لحاظ تعداد ملتی ہے۔ اپنے ملک کے علمی، تاریخی اور مذہبی مقامات کی زیارت بھی ان کا ایک قابل ذکر مشغلہ ہے۔ اس لئے عام طور پر تمام ایرانیوں کو بھی اپنے ملک کی تاریخی حیثیت کے بارے میں بڑی اچھی معلومات ہیں۔ غرضکہ گھومنا پھرنا، کھانا پینا اور خوش رہنا ایرانی قوم کی فطرت ہے۔

رسل و رسائل

ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے نقل و حمل کے ذرائع بھی تقریباً ہر شہر میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ پٹرول سستا ہونے کی وجہ سے ٹیکسیوں، بسوں اور دوسری سواریوں کا کرایہ بھی برائے نام ہے کسی شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے فی کس پانچ ریال درکار ہوتے ہیں جو بچپاس پیسوں کے بقدر ہوتے ہیں۔ سٹی بس کے ذریعہ سفر کرنے والوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے صرف دو ریال کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ عام طور پر لوگ اکٹھا ٹکٹ خرید لیتے ہیں جو بوقت ضرورت کام آتے رہتے ہیں ایک شہر سے دوسرے شہر اور مختلف قابل ذکر مقامات کی سیر کرانے کے لئے ایران میں کئی بس سروسیں قائم ہیں۔ ٹی۔ بی۔ ٹی، ایران تور، ایران نورداور گیتی تور وغیرہ اچھی سروسوں میں شمار ہوتی ہیں۔ جن کی بسیں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے مسافروں کو سفری سہولیت بہم پہونچاتی ہے۔ مذکورہ سروسوں کی خوبصورت جاذب نظر، ایرکنڈیشنڈ بسیں طویل سے طویل سفر کے دوران کاکولا اور پیپسی کولا

وغیرہ سے مسافروں کی پیاس بجھاتی رہتی ہیں۔ ان بسوں کی نشستیں اتنی آرام دہ ہوتی ہیں کہ انھیں معمولی سی جنبش کے ساتھ لیٹنے کے لئے بنچ کی شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ غرضکہ یہ بسیں طویل سفر کے دوران بڑی آسائش فراہم کرتی ہیں جن کی وجہ سے مسافروں کی بڑی تعداد ٹرین سے زیادہ بذریعہ بس سفر کرتی ہے۔

تعلیمی میدان میں

ایران میں تعلیم یافتہ افراد اور طالب علموں کا فیصد گو کہ تقریباً تمام ترقی پذیر ملکوں کی بہ نسبت کم ہے لیکن سارے ملک میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے سرگرمیاں جاری ہیں۔ کودکستان، دبستان اور دبیرستان کی سطح کے اسکول اب تقریباً ہر شہر میں بہ کثرت موجود ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد میں بچے انگریزی نیز مادری زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ صاحب حیثیت گھرانوں کے زیادہ تر بچے حصول علم کے لئے غیر ممالک میں بھیج دئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں بھی ایران میں مستقل پیش رفت ہو رہی ہے۔ نئی نئی یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ادب تاریخ، فنون لطیفہ اور جدید علوم و فنون سے بھی طلباء کو متعارف کرایا جارہا ہے۔ ایرانی طالب علموں کا تعلیمی رجحان اب ادب یا فنون لطیفہ کے بجائے سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف زیادہ ہے۔ ان طلباء کو مذکورہ علوم کی تحصیل کے لئے ایرانی حکومت لیاقت کی بنا پر ہر سال غیر ممالک میں اپنے اخراجات پر بھیجتی ہے۔ اس وقت تقریباً پچیس ہزار طالب علم سرکاری اخراجات اور وظائف پر غیر ممالک میں جدید علم کی تحصیل میں مصروف ہیں۔ یہی طالب علم جب تحصیل علم کے بعد اپنے وطن واپس آئیں گے تو ملک کی داخلی ضروریات پوری کرکے اس کو خود کفیل بنانے میں مدد دیں گے۔ دراصل ملک کا مستقبل یہی نوجوان ہیں جنھیں قومی ذمہ داریوں کا بوجھ اب اپنے کندھوں پر اٹھانا ہے۔ ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایرانی حکومت تعلیم نسواں کو بھی بڑی اہمیت دیتی ہے۔

کھیل کود

کھیل کے میدان میں بھی ایران ایشیا کے ممالک سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کے کھلاڑیوں نے فٹ بال، کشتی اور تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لے کر کئی مرتبہ اولمپک کھیلوں میں طلائی تمغے جیتے ہیں۔ چوگان بازی (Polo) ایران کا قومی کھیل ہے لیکن اب اس کی عوامی مقبولیت قدرے کم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ مذکورہ کھیلوں نے لے لی ہے۔ والی دبال، باسکٹ بال، اور گھوڑے سواری میں بھی ایرانی کھلاڑی کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کھیلوں اور کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے سرکاری کونسلیں قائم ہیں جو اچھے کھلاڑیوں کی تربیت اور مشق کا انتظام کرتی ہیں۔ ایرانی عورتوں کی نئی کونسل کی طرف سے خواتین کے کھیل کود خصوصاً تیراکی، ورزش اور کرتب بازی کی اعلیٰ پیمانے پر تربیت دی جاتی ہے۔ آب بازی کے کئی سنٹر اور سوئمنگ پول اسی ادارہ کے زیر انتظام قائم ہیں۔

گرمابہ

ایران کا موسم زیادہ تر سرد رہتا ہے اور پہاڑوں پر برفباری بھی ہوتی ہے۔ اس لئے گرم ملکوں کی بہ نسبت وہاں نہانے کا رواج بھی نسبتاً کم ہے۔ شاید اسی لئے گھروں میں عام طور پر غسل خانے نہیں ہوتے بلکہ غسل خانوں کی کمی عوامی گرمابے (حمّام) پوری کرتے ہیں۔ ان گرمابوں میں مردانے اور زنانے حصّے الگ الگ ہوتے ہیں جن میں نہانے کے لئے موسم کے مطابق گرم یا ٹھنڈا پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ یہاں عموماً کم اخراجات کی وجہ سے ایک تالاب نما حوض کے کنارے بیٹھ کر مجموعی طور پر لوگ نہاتے ہوئے ملتے ہیں۔ خاص طور پر اکیلے نہانے والوں کے لئے علیحدہ کیبن بنے ہوتے ہیں جہاں بدن ملنے اور نہلانے کے لئے دو تین تومان کے معمولی خرچ کے عوض حسب طلب "کارمند"

بھی مل جاتے ہیں۔

صنعت وحرفت

صنعت وحرفت کے میدان میں ایران تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ملک میں بھاری صنعتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ گھریلو صنعتوں اور دستکاری کو بھی سرکاری اور عوامی طور پر برابر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ایران کی سب سے بڑی قومی، سیاسی اور معاشی صنعت تیل کی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری صنعتوں میں بھی کافی پیش رفت ہوئی ہے اور اس سلسلہ میں بہت کام ہونا باقی ہے۔ ایران میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں خواہ وہ ایرانی کارخانوں سے ہی تیار ہو کر کیوں نہ نکلتی ہوں لیکن وہ ایرانی اصل نہیں کہی جا سکتیں۔ مثلاً ایرانی ملوں سے کپڑا تیار ہو کر قابل لحاظ تعداد میں نکلتا ہے لیکن اس کا سوت عام طور سے غیر ملکی ہوتا ہے۔ اسی طرح لوہے کی مصنوعات بھی عام طور پر غیر ملکوں سے درآمد کئے ہوئے خام مال سے تیار کی جاتی ہیں۔ غرضکہ ایرانی صنعت کے میدان میں نصف سے زائد خود کفیل ہو چکے ہیں اور جدّ وجہد کے میدان میں کامیاب اور سرخرو ہونے کے لئے ان کی دوڑ ابھی جاری ہے۔ گھریلو صنعتوں اور دستکاری میں قالین بافی ایران کی سب سے بڑی اور اہم صنعت ہے۔ ملک کے مختلف خطّوں میں ایرانی فنکار اپنے یگانۂ روزگار شاہکاروں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ اصفہان ملک میں قالین بافی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے کاریگر ایسے عمدہ اور لاجواب قالین مکمل کر کے پیش کر چکے ہیں جو اب صرف عجائب خانوں، نمائش گاہوں اور آثار قدیمہ کے حفاظت خانوں کی زیب و زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ صفوی دور کے مشہور حکمراں شاہ طہماسپ کی درباری محفلوں کے مکمل منظر اور ان کی تفصیلات ان قالینوں کی نقش کشی کے ذریعہ اب تک نمایاں اور اظہر من الشمس ہیں۔ کاشی کاری۔ خام کاری اور ٹکسٹائل پرنٹنگ کا فن بھی اب صرف اصفہان کے حدود میں ہی باقی رہ گیا ہے۔ ان فنون سے متعلق کاریگر ملک کے مختلف حصّوں میں تعمیر ہونے

والی عمارتوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے مشہور ہیں۔

(MINIATURE WORK) کے صاحب کمال بھی اصفہان کے میدان شاہ کے اردگرد ہی ملیں گے۔ ایسے کئی کاشی کاروں، خام کاروں اور مینیا تور کے فنکاروں سے ایک گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انھیں اپنے فن کمال کے صلہ میں دنیا کے مختلف ممالک کی اہم شخصیات سے مہارت کی سندیں اور تصدیق نامے مل چکے ہیں جن میں ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کے ہاتھ کا ایک ستائش نامہ اور روسی لیڈر برژنیف کا دیا ہوا میڈل شامل ہے۔ جو میدان شاہ میں قائم "فائن آرٹ اسٹور" کے مالک آقائی سید احمد اخوّت پور کی فنی خدمات کے طور پر انھیں ملا ہے۔ آقائی اخوت پور کی مینا تور پینٹنگ ہندوستانی میگزین "شنکر ویکلی" میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور ۱۹۶۴ء میں انھیں "شنکر ٹرافی" بھی مل چکی ہے۔ ایران کی قدیم ہندی میراث وہاں کا فن عمارت سازی ہے۔ ایرانی فن تعمیر تقریباً ساری دنیا میں عام ہو چکا ہے اور ہندوستان میں مغل عہد نیز اودھ کے نوابی عہد میں جس نقشے پر تمام تعمیرات تکمیل کی منزل کو پہنچی ہیں وہ خالص ایرانی طرز تعمیر ہے۔ ایران کی دیگر صنعتوں میں چائے کی صنعت بھی کافی اہمیت کی حامل ہے۔

"دوپتیوں" اور "ایک کلی" کے تناسب سے تیار کی ہوئی ایرانی چائے اب ملک بھر میں اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ غیر ملکی درآمد پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑا ہے۔ دوسری صنعتوں کے سلسلہ میں بھی ایرانی ہمہ جہتی ترقی کر رہے ہیں اور اگر ان کی یہ رفتار ترقی برقرار رہی تو غیر ملکوں سے درآمد کئے جانے والے سامانوں کی کھپت ایرانی بازاروں میں روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ ایران کے تمام سات سالہ ترقیاتی منصوبوں میں ملک کی خود کفالت اور خود اعتمادی کی طرف خاص طور سے توجہ دی جا رہی ہے۔

بازار

ایران کے تقریباً تمام بڑے شہروں کے خاص بازار بھی بہت نفیس اور بے مثال

ہیں۔ یہ بازار زیادہ تر چھتوں سے ڈھکے ہوئے اور سرنگوں کی طرح دور تک پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے بعض بازار تو بہت بڑے تاریخی اہمیت کے ہیں۔ اصفہان کا خاص بازار جو میدان شاہ میں "دروازۂ قیصریہ" سے ملحق ہے وہ صفوی دور کے ممتاز فرمانروا شاہ طہماسپ کے ذوق سلیم کی یادگار ہے۔ شیراز کا خاص بازار "سرائے مشیر" کریم خاں زند کے عہد کی حسین و لطیف نشانی ہے۔ تہران کا بازار "بزرگ" یا بازار شاہ بھی کچھ کم تاریخی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس بازار میں گنبد نما چھتوں سے ڈھکی ہوئی ہزاروں دوکانیں دو رویہ بنی ہوئی ہیں جن میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں تھوک اور پھٹکر قیمتوں پر ملتی ہیں۔ اس بازار کی ترتیب بھی بہت اچھی ہے۔ دوکانوں کی لاتعداد قطاریں ہیں، ہر ایک قطار میں ایک ہی قسم کی چیزوں کی دوکانیں آراستہ ہیں مثلاً جو لائن اسٹیشنری سے متعلق ہے وہاں صرف اسٹیشنری کی دوکانیں ہی ملیں گی اور جہاں تیار شدہ ملبوسات ملتے ہیں وہاں دوسرا سامان نہ ملے گا۔ اسی طرح جوتے، چپل، کپڑوں کی سلائی، چمڑے کے سامان، تصاویر اور کلنڈر، المونیم، لوہے اور پلاسٹک وغیرہ کی مصنوعات کی دوکانیں الگ الگ قطاروں میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایران کے ان قدیم اور روایتی بازاروں کے علاوہ اب پورے ایران میں عام طور پر اور خصوصاً اس کی راجدھانی تہران میں جدید طرز کے بہت بڑے بڑے بازار قائم ہو گئے ہیں۔ دراصل کئی کئی منزلہ عمارتوں میں قائم ہونے والے یہ "مشترکہ مقاصد" کے بازار مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ ان بازاروں میں روزمرہ ضروریات زندگی کی تمام چیزیں مناسب قیمتوں پر ملتی ہیں تہران کے روایتی بازاروں میں "بازار بزرگ" اور "بازار نامرخسرو" بہت اہم ہیں اور جدید طرز کے "سلف سروس" بازاروں میں "فروشگاہ کوروش" اور "فروشگاہ فردوسی" وغیرہ بازار ایک چھوٹے موٹے شہر کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں سے کسی قسم کے سامان کا گاہک مشکل ہی سے مایوس ہو کر لوٹتا ہوگا۔ ان بازاروں میں موٹر، موٹر سائیکل، ٹائپ رائٹر، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیلیفون اور ہر قسم کی مشینری کے ساتھ ہی ساتھ سبزی، گوشت،

آٹا، دال، کپڑے، اور دیگر سامان بھی حکومت کے مقرر کردہ مناسب نرخ پر ملتا ہے
تہران میں شاہ رضا ایونیو (یونیورسٹی کے سامنے) پر کتابوں کا بازار بھی بہت قاعدے اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہاں کتابوں کی ایسی ان گنت دکانیں موجود ہیں جن میں تقریباً تمام علوم و فنون کی نئی اور پرانی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ خیابان پہلوی تخت جمشید بلوار الزابیت اور رانٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے علاقہ کے بازار بھی بہت صاف ستھرے اور قابل دید ہیں۔

سبیلیں

تہران، اصفہان، شیراز، مشہد اور دوسرے شہروں میں خرید و فروخت کے مراکز کے درمیان موسم گرما میں عام طور پر ٹھنڈے پانی کی ٹنکیاں رکھی رہتی ہیں جس کا انتظام دکاندار اپنے اشتیاق اور عقیدے کے تحت کرتے ہیں اور اس طرح پیاسے راہگیروں کو پانی پلا کر حضرت حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان ٹنکیوں کے ارد گرد ڈوریوں میں بندھے ہوئے دو تین گلاس لٹکے ہوتے ہیں جن میں ہر شخص اسلامی روایات کے مطابق بلا تکلف اور بلا تفریق پانی پی کر اپنی پیاس بجھا سکتا ہے ہاں البتہ اس کی دو معمولی لیکن اہم شرطیں ہیں۔ اول تو کوئی شخص پانی پینے سے پہلے یا بعد میں گلاس دھونے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ ایرانیوں کی نظر میں قابل نفرت ہو جائے گا اور دوسری شرط پانی کی مذکورہ ٹنکیوں پر لکھے ہوئے اس مصرعے کی شکل میں

مُزد این است کہ لعنت بر یزید

(ترجمہ:- اس کی یہ اجرت ہے کہ یزید پر لعنت بھیجو)

بعض چھوٹے چھوٹے دکاندار جو بڑی ٹنکیاں اپنی دوکان کے سامنے رکھنے کے قابل نہیں ہیں وہ ایک بڑے پیالے ہی میں ٹھنڈے پانی کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان پیالوں

میں ہر طبقۂ زندگی کے لوگ منہ لگا کر پانی پیتے ہوئے قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور اسلامی شریعت کا جیتا جاگتا نمونہ نظر آتے ہیں۔

تجارت، ملازمت اور غیر ملکی

دنیا بھر کے غیر ملکی مہاجرین ایران میں روپیہ کمانے کی غرض سے آتے رہتے ہیں بعض افراد یہاں کی زندگی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایرانی قومیت حاصل کر لی ہے۔ جس طرح صفوی دور حکومت کے اواخر میں ایرانیوں میں ترک وطن کر کے ہندوستان آنے کا رواج عام ہو گیا تھا اسی طرح آج کل ہندوستان سے ایران مراجعت کرنے والوں کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد ہے۔ جن میں ڈاکٹر، انجینیر اور دوسرے تکنیکی ماہرین کے علاوہ تجارت اور سرکاری نیز نجی زمروں میں کام کرنے والے تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ افراد ہزاروں کی تعداد میں شامل ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایران میں معمولی معمولی کام کرنے والے کاریگروں اور خصوصاً تکنیکی ماہرین کے ماہانہ مشاہرے ہزاروں روپیہ کے ہم قدر ہوتے ہیں۔ ایران جانے کے خواہش مند افراد کے لئے اپنی متعلقہ حکومت سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر حکومتیں اپنے ملک کے لائق اور ہونہار لوگوں کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کا رویہ اپناتی ہیں۔ ورنہ بہت سے افراد اور ایسے ادارے بھی ہیں جو غیر ملکوں میں ملازمتیں دلوانے کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ان افراد اور ایجنسیوں کے ذریعہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر سرزمین غیر پر قدم جمانے کے خواہش مند بھولے بھالے اور معصوم افراد کبھی کبھی بڑی زحمتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے ڈاکٹر، انجینیر اور دوسرے تکنیکی ماہرین بڑی تعداد میں ایران کے مختلف شہروں میں موجود ہیں اور اپنی خدمات نہایت مستعدی اور پابندی سے انجام دے رہے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ہندوستانی اساتذہ ادبیات، تاریخ، سماجی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم دے

ورنہ دنیا کی ہر چیز اس کی نظر میں حسین و جمیل ہونے کے باوجود بے کشش اور غیر جاذب نظر ہوتی ہے۔ خسرو کی حسن پرستی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے حسن سے قطع نظر کر کے ایک معمولی سنار کے لڑکے کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ ذیل کا قطعہ مذکورہ امر کا شاہد ہے اور خسرو کی زبان "ہندوی" کے نمونے کے طور پر بھی اُسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ عام فہم اور عوامی زبان کے استعمال پر انھیں واقعی مہارت تامّہ حاصل ہے۔ قطعہ دیکھئے ؎

زرگر پسری چو ماہ پارہ
کچھ گڑھئے، سنواریئے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ خسرو کے مزاج اور کلام میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ لیکن انھوں نے شعوری طور پر ان کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کے کلام اور افکار کا ایک بڑا حصّہ مذکورہ بالا عناصر پر ہی مشتمل ہے۔ ان کے افکار اور خیالات میں قومی یکجہتی کے عناصر یقیناً اس جذباتی ہم آہنگی کی وجہ سے منصّۂ شہود پر آئے ہوں گے جو انھیں لشکر کی زندگی اور مسلسل گیارہ مختلف المزاج حکمرانوں کے درباروں سے وابستگی کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ کسی بھی لشکر اور دربار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہاں موجود ہوتے

رہے ہیں اور بہت سے لوگ نجی زہرے کی تجارتی فرموں اور دیگر دفاتر میں برسر روزگار ہیں۔

تہران میں پنجابی ہندوستانیوں (سکھ فرقے) کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو تقسیم ہند کے وقت ترک وطن کر کے ایران میں آباد ہو گئی تھی۔ تہران میں ان لوگوں کی ایک کالونی سی بس گئی ہے جس میں کئی ہزار لوگ مستقل بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ خیابان چراغ برق پر واقع اس علاقہ کو "بازار ہندی" کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی عبادت کے لئے ایرانی حکومت نے اسی علاقے میں ایک "مسجد ہندی" (گردوارہ) تعمیر کرنے کی بھی اجازت دے دی ہے جہاں مذکورہ فرقے کے لوگ عبادت کرتے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً تیس برس سے یہاں رہ رہے ہیں اور اب یہیں کے مستقل باشندے بھی ہو گئے ہیں، اس لئے انھیں ملکی لوگوں جیسے حقوق حاصل ہیں۔ تقریباً ایک نسل بیت جانے کے بعد وہ ایرانی زبان، معاشرت اور طرز رہائش سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ اب ان میں سے اکثر کی شناخت بھی مشکل ہے۔ اب ان میں اور ایرانیوں میں مخلوط شادیاں بھی ہونے لگی ہیں، غالباً اس کے بعد والی نسلوں میں یہ امتیاز اور کم ہو جائے گا۔ تہران میں جس قسم کی عبادت گاہ کا اوپر ذکر آیا ہے اسی قسم کی ایک عبادت گاہ کا وجود شیراز میں بھی مسلّم ہے، جہاں ایک مشہور پنجابی صوفی کا مزار بھی موجود ہے۔ اس تاریخی عبادت گاہ کی زیارت کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ سے سکھ فرقے کے لوگ اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔ اس فرقے کی کافی تعداد کے پیش نظر زاہدان میں بھی ایک گردوارہ بنانے کی اجازت حکومت نے دے دی ہے۔

تیوہار

عیسوی سال کے اعتبار سے ہر سال کی ۲۱ مارچ کو ایران میں نئے سال کا

آغاز ہوتا ہے ۔ اسی دن ایرانی سال کے پہلے مہینے فروردیں کی یکم تاریخ ہوتی ہے اور اسی تاریخ سے وہاں سہ ماہی موسم بہار کا آغاز بھی ہوتا ہے ۔ اس "مقدس دن" اور "پاکیزہ تاریخ" کو ایرانی عوام " نوروز" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ہزاروں سال سے کسی جشن کی طرح منایا جانے والا یہ دن ایران کے "سال نو" اور قومی تیوہار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مسلسل تیرہ دن تک منائے جانے والے اس تیوہار کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہو جاتی ہے ۔ نئی چیزوں کی خریداری اس سلسلے میں نیک شگون تصور کی جاتی ہے ۔ آریائی رسوم کے مطابق نوروز کی تیاریوں کے سلسلے میں گندم بویا جانا بہت اہم ہے اور اس گندم کے پودے کو پانی میں بہا دیا جاتا ہے ۔ "ہفت سین" تیار کرنے میں بھی یہ لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ "ہفت سین" اس طشت کو کہتے ہیں جس میں سات ایسی چیزیں چنی ہوتی ہیں جن کے نام "سین" سے شروع ہوتے ہیں ۔ یہ سات نام سپند، سیب، سبز سرکہ، سمنو، سنجد اور سماق ہیں ۔ (سمنو ایک قسم کے حلوے کو کہتے ہیں اور سماق انار دانہ کو) جشن نوروز منانے کے لئے ایرانی جذبات سے بے قابو ہو کر ٹولیوں کی شکل میں گاتے بجاتے ہوئے عام شاہراہوں پر نکل آتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں ۔ نئے سال کی تہنیت کے طور پر بڑی تعداد میں گریٹنگ کارڈوں اور گھر کی صفائی اور سجاوٹ کے دوسرے سامانوں کی بے مثال خرید و فروخت ہوتی ہے ۔ نوروز کے اعلان کے طور پر شہروں اور بستیوں میں ایک گولہ داغا جاتا ہے اس کی آواز سن کر ایک دوسرے کو محبت، خلوص اور شفقت کا بوسہ اور دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں ۔ مٹھائیاں کھلائی جاتی ہیں اور بزرگ اپنے چھوٹوں کو "عیدی" کے طور پر رقمیں دیتے ہیں ۔ لوگ ملاقات کی غرض سے ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں ۔ بچے بھی رنگین زرق برق پوشاکوں میں ملبوس اپنے والدین کے ساتھ "جشن نوروز" کی رونق اور گھما گھمی میں پوری طرح منہمک

اور مصروف رہتے ہیں ۔ غرضکہ اس تیوہار میں ایک طرف تو خالص مغربی انداز و اظہار کی نمائش ہے اور دوسری طرف آریائی اور مشرقی قدروں کا احترام ۔

"جشن نوروز" کی وجہ تسمیہ "آغاز سال نو" ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم ہے ۔ روایت ہے کہ اسی دن جمشید اپنی گاڑی پر سوار ہو کر دیوؤں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے نکلا تھا ۔ اور انھیں شکست فاش دینے کے بعد وہ فروردین کی چھ تاریخ کو کافی زر و جواہرات، مال غنیمت کے طور پر لے کر واپس لوٹا تھا اور انھیں زر و جواہر سے اس نے ایک تخت بنانے کا حکم دیا تھا ۔ شاہنامہ فردوسی میں بھی جابجا اس قسم کے اشارے ملتے ہیں ؎

بہ جمشید برگوہر افشاندند
بر آں روز را "روز نو" خواندند
چنیں روز فرخ ازاں روزگار
بماندہ ازاں خسروان یادگار

تابستان یعنی موسم گرما کے وسط میں شیراز میں ایک سالانہ "جشن ہنر" آراستہ کیا جاتا ہے ۔ یہ جشن ایک ہفتہ تک منایا جاتا ہے اور اس کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ ایشیا کے قدیم و جدید فنون لطیفہ کو سال میں ایک بار یکجا ہونے کا موقع فراہم کیا جائے اور اس طرح ایشیا کے تمام ممالک کو ایک دوسرے کے سماجی اور تہذیبی ماحول کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوششوں کو استحکام بخشا جائے ۔ اس قسم کی کوششیں بین الاقوامی اور عالمی ماحول میں یکسوئی اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت اہم اور کارآمد ہیں ۔ مذکورہ جشن ہنر میں شامل ہونے والے دیگر ممالک کے فنکاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فنکار بھی عوامی مقبولیت اور شہرت کے حامل ہیں ۔ فلمی ستاروں میں راج کپور، نرگس، راج کمار، فیروز خاں، سنجے خاں، اور ہیما مالنی وغیرہ بہت مشہور ہیں ۔ سنہ ۱۹۷۶ء کے "جشن ہنر" میں ہندوستانی کلاسیکی اور رقص کے فنکاروں

نے وہاں کے عوام کے دل جیت لئے تھے اور بڑے ہر دلعزیز ہوئے تھے۔

موجودہ شہنشاہ ایران تقریباً پچیس سال قبل جلاوطنی کے بعد جب دوبارہ سرزمین ایران پر وارد ہوئے تھے تو ایرانی عوام نے ان کا شاندار اور تاریخی استقبال کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر عوام نے مہرآباد ہوائی اڈے سے شاہی محل تک تقریباً پچیس کیلومیٹر سڑک کو قالینوں سے ڈھک دیا تھا۔ اسی دن کی یاد میں آج تک جشن استقبال منایا جاتا ہے اور ملک کے اطراف وجوانب کو برقی قمقموں سے روشن کرکے عوامی طور پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ملک کی واحد سیاسی جماعت "رستاخیز" بھی چونکہ اسی وقت عالم وجود میں آئی تھی اس لئے مذکورہ دن کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ گو کہ ایران میں شاہی سکہ رائج ہے، ملک میں ہر طرف شہنشاہیت کا دور دورہ ہے اور "مشروطیت" یا "مشروطہ حکومت کا وجود وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ صرف صفحات تاریخ کی زینت بن کر رہ گیا ہے لیکن سابقہ ادوار میں اسی طرز حکومت نے ایران کی داخلی اور خارجی ضروریات کو پورا کرنے نیز عالمی میدان میں ایران کی ساکھ قائم کرنے میں اس نے جو نمایاں اور قابل قدر رول انجام دیا ہے اس کی یاد برقرار رکھنے اور اس کے لئے اپنی قدر ومنزلت کا اظہار کرنے کے لئے آج بھی ایران میں جشن "مشروطیت" بڑی دھوم دھام اور آب وتاب کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عوامی اور سرکاری طور پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جشن چراغاں اور دوسری تقریبات کا بڑے پیمانہ پر انعقاد کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا قومی تیوہاروں کے علاوہ ایران میں کچھ مذہبی تقریبات بھی بڑی شان سے منائی جاتی ہیں۔ شب برات اور عید غدیر اس کی کڑیاں ہیں۔ عید غدیر خوشی کا موقع ہے جبکہ شب برات عبادت اور تجدید عقائد کا ایک روایتی دن ہے۔ شب برات کے سلسلے میں ایران میں بھی تقریباً وہی روایات رسوم اور رواج موجود ہیں جو ہمیں اپنی ہمہ گیری کے ساتھ لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں

دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حلوہ، شیرینی، نذر، نیاز، عبادت، چراغاں، آتش بازی غرضکہ سارے راسخ اور ضعیف عقائد من وعن ایران سے ہجرت کر کے لکھنؤ آگئے ہیں اور صدیوں سے بغیر کسی تبدیلی کے اپنی اصل شکل میں پروان چڑھ رہے ہیں۔

ہند۔ ایران روابط

لفظ "ایرا" کی جمع ایران ـــ "آریہ" سے ماخوذ ہے جو سنسکرت اور اوستائی زبانوں میں آزاد اور پاک وصاف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ ازمنۂ قدیم میں آریائی قوم کے دو سر برآوردہ گروہوں نے ایران اور ہندوستان دونوں ملکوں کو آباد کیا تھا جو مشترکہ طرز معاشرت اور تہذیب وثقافت کے حامل تھے ۔ انھیں گروہوں کی عملی کوششوں سے "ایران کشنیز" اور "آریہ ورت" کا وجود عمل میں آیا جو بعد میں ایران اور بھارت ورش کی حیثیت اختیار کر گئے ۔ دونوں ملک اپنی جغرافیائی حیثیت اور ماحول کی تبدیلیوں کی وجہ سے الگ الگ ضرور ہیں لیکن ان کا انداز فکر یکساں ہی رہا ۔ اس لئے ہند ایران تعلقات کی کوئی یقینی تاریخ مقرر کرنے میں تمام مورخین بے بس اور بے دست و پا نظر آتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلقات سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانے ہیں لیکن ان کی ابتدا کب ہوئی ؟ یہ امر ابھی موضوع تحقیق ہے ۔

قدیم تاریخ کی روشنی میں اگر ہند ایران روابط کا جائزہ لیا جائے تو ایسے اشارے جابجا ملیں گے جن کی مدد سے دونوں ملکوں کے مذاہب اور رسوم ورواج میں یکسانیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ آریائی نسل سے تعلق رکھنے کی بنا پر دونوں ملکوں کے عوام میں بڑی حد تک سماجی اور اخلاقی یک رنگی پائی جاتی ہے ۔ ہندوستان اور ایران کے رشتے بہت قدیم ہیں ۔ ان کا کلچر اور رہن سہن ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے اور ان دونوں قوموں کی بیشتر اقدار مشترک ہیں ۔ زندگی بسر کرنے کے بہت سے طور

طریقے یکساں ہیں ۔ آگ کی پوجا ہندوستان کی قدیم ترین رسم ہے لیکن سرزمین ایران پر جنم لینے والے مذہب زرتشت میں رائج آتش پرستی بھی اس سے مختلف نہیں ہے ۔ ان دونوں ملکوں کی یہی وہ مشترک اقدار ہیں جنھوں نے ادبار زمانہ کے باوجود امن و آشتی کی جستجو میں ایک دوسرے کی روایات کو گلے سے لگائے رکھا اور آپسی اتحاد کے فروغ کو کسی قیمت پر کم نہیں ہونے دیا ۔ ہندوستانی عاملون اور ان کے گرنتھوں کو بھی ایران میں بڑی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اسی سلسلہ میں "پنچ تنتر" سب سے اہم اور مقبول گرنتھ ہے ۔ حملۂ اسلام کے وقت زرتشتی اور آتش پرستوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایران سے فرار اختیار کر کے ہندوستان میں پناہ گزین ہوئی تھی ۔ ان لوگوں کی مستقل بود و باش کی وجہ سے ہندوستانیوں کو ایران سے قریب ہونے کا ایک نادر موقع ہاتھ آیا تھا ۔ تصوف اور عرفانیت کی ان چند لہروں کی وجہ سے بھی دونوں ملکوں میں بڑی حد تک قربت پیدا ہوئی جو ایرانی فوجوں کے ساتھ بیس ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہوئیں ۔ چند اہم مشترکہ شادیوں کی وجہ سے ان تعلقات میں مزید اضافہ ہوا ، اس قسم کی شادیوں میں سب سے قدیم اور تاریخی شادی ساسانی حکمراں بہرام گور کی ہے ۔ وہ قنوج کے راجہ شنگل کا داماد تھا ۔ اپنے عدل و انصاف کی بنا پر ساری دنیا میں مقام امتیاز حاصل کرنے والے نوشیرواں عادل کی بیٹی راجپوت راجہ یا پارادل کی زوجیت میں تھی ۔ قدیم ایران میں بودھی خانقاہوں اور مہاتما بدھ کے مجسموں کا انکشاف ہندوستانی مذاہب کی مقبولیت کا ثبوت ہے

فارسی :

محمود غزنوی کے حملوں کے توسط سے فارسی زبان ہندوستان میں داخل ہوئی اور ضرورت کے مطابق ترقی کرتی رہی ، اسی زبان نے اپنی دلکشی اور شیرینی کی وجہ سے بہت جلد ہندوستانی عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی ۔ مقامی بولیوں میں فارسی کے الفاظ و محاورات تیزی سے شامل ہونے لگے ۔ فارسی زبان نے بھی سنسکرت اور ہندی

کا اثر قبول کیا - ایرانی محققین کے لئے عربی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم بھی لازمی ہوگئی غرضکہ دونوں ملکوں کی زبانوں کا اختلاط بڑھتا گیا اور ہندوستان میں فارسی زبان کا باقاعدہ ارتقاء بھی شروع ہوگیا - عہد قدیم سے ازمنۂ وسطا اور اس کے بعد سے دور جدید تک یہ سلسلہ قائم و دوائم ہے - افغان سرداروں اور اپنے بھائیوں کی بے اعتنائی سے تنگ آکر جب شہنشاہ ہند ہمایوں نے اصفہان پہونچ کر شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی تو شاہ موصوف نے ایرانی فوجوں کی کمک اور کافی دولت دے کر ہمایوں کو دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کرکے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لینے کے قابل بنادیا - یہ واقعہ ہند ایران روابط کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے - اسی دور میں ایک ایرانی امیر شیخ جام کی بیٹی حمیدہ بانو سے ہمایوں کی شادی بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے - مغل حکمرانوں نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دے کر ہندوستانی عوام کے ذہنی تقاضوں کو ایرانی عوام اور ان کی زبان سے منسلک کردیا - "دو جسموں کے درمیان ایک زبان" - اتحاد اور اشتراک کی حد ہوگئی - مغل شہنشاہ اکبر نے امتیاز و افتراق کی باقی ماندہ دیواروں کو گرا کر دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں تاریخی رول ادا کیا ہے - اس دور میں اول تو صفوی دور کے حکمرانوں کی بیزاری کی وجہ سے، دوسرے اکبر اعظم کی انصاف پسندی اور داد و دہش کے سبب ایران کے بہت سے سربرآوردہ لوگ ہندوستان آگئے تھے - صاحب منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بداؤنی کے بقول صرف اکبر کے دربار میں ایک سو ستر (۱۷۰) نامور ایرانی علماء، فضلاء، ادباء، اور شعراء موجود تھے -

تاریخی اہمیت کے ذی علم حضرات کی موجودگی اور شعراء و ادباء کی دربار سے وابستگی کی وجہ سے دونوں ملکوں کے عوام و خواص کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں بڑی مدد ملی - اس طرح دونوں ملکوں کے اہل قلم، دانشور اور ان کے توسط سے عوام باہم شیر و شکر رہے ہیں - اکبر کے جانشینوں کے دور میں بھی فارسی ہی سرکاری

زبان رہی - اور یہی زبان عرصۂ دراز تک ہندوستان کی قومی زبان بنی رہی - غزالی، فیضی، عرفی، طالب، کلیم، قدسی، نظیری اور ملک قمی جیسے شعراء نیز ابوالفضل، ابوالفتح گیلانی اور ظہوری ترشیزی جیسے اکابرین اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں سے وابستہ رہے اور ان کے علم و کمال کا سکہ ہندوستان میں عرصہ تک چلتا رہا - ان کے بعد برسر اقتدار آنے والے دوسرے مغل بادشاہوں نے بھی فارسی زبان اور اس کے اہل کمال کے ساتھ بڑی فراخدلی اور وسیع النظری کا سلوک کیا اور انھیں مناسب انعام و اکرام نیز جاہ و مناصب سے نوازا - اس دور میں تحصیل کمال کے لئے ایرانیوں کا ہندوستان آنا ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا - ہندوستانیوں کی سخن فہمی اور سخن سنجی بہت مشہور تھی اور جو شاعر یا ادیب ان کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا اسے قبول و عام کی سند حاصل ہوتی تھی - اس دور کے شعرا نے فارسی شاعری میں "سبک ہندی" کی بنیاد رکھی جس کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں شیخ علی حزیں کے قیام ہند بلکہ ان کی وفات تک جاری رہا - ایرانی اور ہندوستانی حکمرانوں اور امراء کے درمیان خط و کتابت، تحفے تحائف نیز خیر سگالی وفود کے تبادلے تقریباً ہر دور میں ہوتے رہے جن کی وجہ سے دونوں ملکوں کے خواص و عوام کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے نمایاں مواقع فراہم ہوئے - مغل بادشاہ جہانگیر کی نور جہاں سے شادی اور امراء، سفراء کے تبادلوں نے دونوں ملکوں کے دوستانہ تعلقات کو مزید استحکام بخشا -

موجودہ دور

موجودہ دور میں ہندوستانی ڈاکٹروں، انجینیروں اور تکنیکی ماہرین نے ہند ایران روابط میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے - ہندوستان کے مختلف خطّوں میں ریلوے لائن بچھانے کا کام عرصۂ دراز سے ہندوستانی ماہرین کی نگرانی میں ہو رہا ہے اس کے علاوہ تکنیکی میدان کے مختلف کاموں میں بھی ہندوستان اور ایران کے درمیان

انتساب

اجنبی ذہانت کی
ان گمنام شعاعوں کے نام
جن کی
آوارہ گردی
حاصلِ سفر ہے

والے لوگ کسی خاص طرز یا نہج کے تحت زندگی گزار رہے ہوں۔
دونوں جگہیں ایسی خصوصیات کی حامل ہیں جہاں ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر
قوم کے افراد و اشخاص ایک دوسرے کے دکھ درد، آرام و آسائش
اور تکالیف و مصائب کے وقت، آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد
اور ہمنوا بن جانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ لشکر کی بے ترتیب
زندگی اور درباروں کی حد سے زیادہ مصنوعی تہذیب، والی زندگی۔
تقریباً دونوں یکساں حیثیت کی حامل ہیں۔ خسرو اپنے مختلف
ہم وطنوں کے ساتھ سلاطین ہند کی افواج میں بھی شامل رہے
اور کئی جنگوں میں براہ راست حصہ بھی لیا۔ نیز ہر طبقہ، فرقہ اور
ذات کے لوگوں کے ساتھ رہتے بستے آخر ان کا مزاج قومی یکجہتی
اور جذباتی ہم آہنگی کا ترجمان اور آئینہ دار بن کر رہ گیا۔ گیارہ درباروں
میں مختلف عہدوں اور منصبوں پر فائز رہنے کے بعد ان کے مذکورہ
بالا نصب العین کو تقویت اور جلا حاصل ہوئی۔ اپنے قومی افکار و
خیالات کی مقبولیت کی بنا پر ہی وہ خود کو اپنے وطن کا جز سمجھنے لگے
تھے اور وطن عزیز کی ہر چیز سے ان کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی
تھی۔ اپنے عمیق مشاہدے اور فکر و تخیل کے سہارے انھوں نے
آسان زبان جس میں ہندوستانیت کا اظہار کیا ہے وہ بالکل غیر شعوری
ہونے کے باوجود عام ہندوستانیوں کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے۔
گو کہ خسرو ہندو تصور الوہیت کے قائل نہ تھے لیکن اس کے باوجود
انھوں نے ایک ایسے نکتہ پر توجہ مرکوز کی ہے جس سے وحدانیت
و ابدیت کی تبلیغ ہوتی ہے۔ خود سوزی اسلام میں قطعی جائز نہیں
ہے لیکن ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ایک

گہرا ربط ہے۔ خام لوہے کے عوض خام تیل اور دوسرا سامان حاصل کرنے کے ایرانی معاہدوں پر عمل درآمد کرنے کے علاوہ ہندوستانی سیمنٹ، کپڑا اور دوسرا سامان ایران بھیجنے کی روایت اس دور میں عام ہے۔ ہندوستانی موسیقی اور رقص ایران میں قبول عام کی سند کے حامل ہیں۔ فلموں اور تہذیبی وفود کے تبادلوں سے دونوں ملکوں کے عوام کے تعلقات عام اور مشتہر کرتے ہیں بڑی مدد ملی ہے۔ ایران میں ہندوستانی رقص و موسیقی کی مقبولیت کا بڑا سبب ہندی فلمیں ہیں جن کے ذریعہ ایرانی عوام مغربی تہذیب کے قریب ہوتے ہوئے بھی، ہندوستانی تہذیب، تمدن اور ثقافت کے رسیا اور دلدادہ ہیں۔

موجودہ دور میں حیرت انگیز طور پر بیدلؔ اور غالبؔ سے زیادہ ٹیگورؔ اور اقبالؔ کو پسند کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ کا فارسی کا کلام ایرانیوں کی نظر میں بہت جامع اور وسیع ہے۔ ٹیگور اپنے خیالات کی پاکیزگی اور وسیع النظری کے لئے مشہور ہیں، ان کی مقبولیت کی وجہ سے پڑھے لکھے ایرانی، ہندوستانی معاشرے سے بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ بہت سے ہندی الفاظ اور محاورات فارسی زبان میں داخل ہو گئے ہیں اور باہم شیر و شکر ہو کر روزمرہ کی زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ گاندھی جی کو بھی یہ لوگ بڑی عقیدت اور محبت سے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ہندوستانی 'جیوتش ودیا' بھی ایران میں بہت مقبول ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانا شروع کر دے (خواہ فن دست شناسی سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو) تو وہاں کے لوگ اسے غیب داں سے کم درجہ نہیں دیں گے۔ ہندوستانی چائے، سگریٹ، سلک، سوتی کپڑا، چمڑے کی مصنوعات اور خوشبویات وغیرہ ایرانیوں کو بہت مرغوب ہیں۔ یہاں کی چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں میں تیار ہونے والی معمولی اشیاء وہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور خاطر خواہ قیمتوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ مٹی کے کھلونے، شیشے اور لکڑی کے بجاوٹی نمونے، جامدانی، کامدانی اور چکن وغیرہ دستکاریوں کے

شاہکار ایرانی بازاروں میں منہ مانگے داموں پر بکتے ہیں۔ ہندوستان میں تیار شدہ مردانے، زنانے جینس پینٹ اور دوسرے سوتی کپڑے بھی عوامی توجہ کا مرکز ہیں۔ یہاں کی ساری بھی اب رفتہ رفتہ ایک پسندیدہ پوشاک بنتی جارہی ہے۔ ایرانی نوجوانوں خصوصاً طلباء میں ہندوستان آکر سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کا بہت اشتیاق پایا جاتا ہے۔ غرضکہ آریائی نسل سے متعلق ہونے کی وجہ سے ایرانی اور ہندوستانی قوموں کے درمیان ایسی مشترک قدریں اور ربط باہم موجود ہے جو صدیوں سے بعض تبدیلیوں کے باوجود اب تک عملی طور پر ایک ہی زنجیر کی "کڑیاں" ثابت ہوئی ہیں۔ قوی توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان دونوں ملکوں کے ذمہ داران اور عوام ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب آنے میں پیش رفت کریں گے۔

ہندوستان کے موجودہ وزیراعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی کی شہنشاہ ایران سے حالیہ ملاقات میں جو نکات تفصیلی طور پر زیر بحث آئے ہیں ان کے پیش نظر حتمی طور کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے دوستانہ تعلقات میں اب مزید اضافہ ہوگا۔ تمام سیاسی اور تجارتی معاہدوں پر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ عمل درآمد ہوگا اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والی یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے مفادات کی باہمی نگرانی کرکے اپنی آئندہ زندگی برادرانہ ماحول میں بسر کریں گی۔

جواہرات سلطنتی ایران

ایران کے جن شاہی نوادرات کو مصنف نے ۱۹۷۶ء میں
بذات خود دیکھا تھا ان میں سے چند کی تفصیل ذیل میں
دی جارہی ہے ۔ اس انمول خزانے کا اب کیا حشر ہوا
واللہ عالم بالصواب ۔

یہاں جتنے نگینے نمائش کے لئے رکھے ہوئے ہیں وہ دنیا کے اہم اور قیمتی جواہرات میں شمار ہوتے ہیں ۔ ان کی داستان بڑی دلچسپ ہے ۔ جو صدیوں سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے ۔ ایران کے شہنشاہوں نے اپنے ڈھائی ہزار سالہ حکومت کے دوران تقریباً ہر زمانے میں تمام مشکلوں سے نجات حاصل کر کے ملک کو اطمینان کی سانس لینے کے مواقع فراہم کئے اور اپنے عوام کی زندگی کو خوشحال بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔

ساسانی بادشاہوں خصوصاً خسرو پرویز کے دربار کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کے افسانے تاریخ کی کتابوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ ساسانی دور حکومت میں عربوں کے حملے سے خسرو کی آماجگاہ میں جو بے حد و حساب غارت گری پھیلی اس کی دردناک کہانی آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی فراموش نہیں کی جا سکتی ۔

ایران کی اسلامی حکومت نے ان حوادثات گوناگوں کے باوجود بھی جس طرح اپنے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو یکجا کیا وہ جواہرات کے لیک نادر الوجود سرمایہ

کی شکل میں اب تک موجود ہے۔ سخت افسوس ہے کہ زمانہ قدیم میں ایران کے شہنشاہی درباروں میں جو بیش قیمت جواہرات تھے ان کے بارے میں صحیح اطلاعات فراہم کرنا بھی ناممکن ہے البتّہ صرف صفوی سلطنت کے بارے میں کچھ سودمند اطلاعات موجود ہیں۔ جو زیادہ تر بیرونی سیاحوں، انتونی جنگینس، ژان باتیست تاورنیہ، شوالیہ شاردن، برادران شرلی دجرج مین وارنیگ وغیرہ کے توسط سے ایران تک پہونچی ہیں۔ دراصل انھوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعہ صفوی بادشاہوں کے خزانے کے بارے میں قیمتی معلومات ہم تک پہونچائی ہیں خصوصًا تاورنیہ نے اپنے سفرنامہ میں بعض ایسے پتھروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جو ایرانی شاہی جواہرات کی تاریخ کے مطالعہ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صفوی بادشاہوں کی پے در پے فتوحات اور ملک میں قومی وجمہوری وحدت کے قیام کے بعد خصوصًا شاہ عباس بزرگ کے دور حکومت میں ایران میں قیمتی جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا اور سیّاحوں کے بقول انھوں نے اس کی جمع آوری اور حفاظت کے لئے بہت سخت اقدامات کئے تھے۔ چنانچہ صفوی بادشاہوں نے اپنے دورحکومت میں شاہی جواہرات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرلیا تھا جو دنیا کے بڑے خزانوں میں شمار ہوتا تھا۔ صفوی دورحکومت میں جواہرات کا یہ خزانہ مندرجہ ذیل طریقوں سے جمع ہوا تھا۔

(۱) جو جواہرات شاہی خزانے میں بچے ہوئے تھے۔

(۲) خراسان اور ترکستان سے بھاگنے والوں نے جو موتی خلیج فارس میں چھوڑدئے تھے۔

(۳) دوسرے ملکوں کے بادشاہوں اور امیروں نیز حکام نے جو جواہرات نذرانے کی شکل میں پیش کئے تھے۔

(۴) جو جنگ کے بعد مال غنیمت کی شکل میں ہاتھ آئے تھے۔

(۵) جو صفوی بادشاہوں نے وقتاً فوقتاً خریدے تھے۔

تاورنیہ اور شاردن کے بموجب شاہان صفوی نے اپنے جواہریوں اور گوہر شناسوں کو ہندوستان، ترکی اور یورپی ممالک مثلاً اٹلی اور فرانس وغیرہ بھیج کر بہت سے جواہرات خرید کر اصفہان منگوائے تھے۔

تقریباً تین سو سال کے عرصے میں نہایت جد وجہد اور ذوق وشوق سے جو صفوی بادشاہوں نے جمع کیا تھا اور جس کی حفاظت میں انھوں نے جان کی بازی لگادی تھی، وہ شاہ سلطان حسین صفوی کے آخری دور حکومت میں افغانوں کے اصفہان پر حملہ کے بعد پراگندہ اور منتشر ہو کر رہ گیا۔ ایک رات محمود افغان اصفہان میں داخل ہوا اور اس نے ایک ہزار افغانوں کو محمد قلی خاں صدر اعظم کی نگرانی میں تمام خزینوں اور دفینوں کو ضبط کرنے کے کام پر مامور کر دیا۔ ابتدا میں یہ کام بڑے نظم وضبط کے ساتھ شروع ہوا لیکن بعد میں اس جمعیت میں شامل کچھ شر پسندوں نے نظام کو درہم برہم کر کے لوٹ مار شروع کر دی اور عین اس وقت جب ایران کے صفوی بادشاہوں کا سرمایہ اپنے پورے عروج شباب پر تھا اس کی بہت بڑی مقدار کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور تمام قیمتی اور انمول جواہرات لٹیروں اور غارتگروں کی ملکیت بن گئے۔

بہت سے نفیس اور عمدہ جواہرات جو صفویوں کے خزانوں میں پہلے سے موجود تھے یا جو انھوں نے منہ مانگی قیمتوں پر بازاروں سے خریدے تھے اب بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آنے لگے جب وہاں ان کی قدر وقیمت کا تعین کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہا تو ان کی فروخت کے لئے ہندوستان کے بادشاہوں کے پرشکوہ درباروں کا انتخاب کیا گیا اور رفتہ رفتہ ان لوگوں نے ہندوستان کی راہوں کو استوار کر کے صفوی بادشاہوں کے ان قیمتی جواہرات کی ایک بڑی تعداد دربار تیموری میں منتقل کر دی۔ خزانے کا صرف وہ بڑا حصہ جو محمود افغان کے قبضہ میں آنے

کے بعد اشرف افغان کو منتقل ہو گیا تھا۔ شاہ طہماسپ دوئم کے نادر شاہ کے ہمراہ اصفہان آنے کے بعد نادر کے ہاتھ لگا اور رفتہ رفتہ ایران سے منتقل ہونے لگا۔ جس وقت شاہ طہماسپ اور نادر اصفہان پہونچے ہیں نقد اور بیش بہا جواہرات پر مشتمل خزانہ جو اُن کی دسترس میں تھا، چند موقع پرست اسے لے کر شیراز کی سمت فرار ہو گئے۔ نادر شاہ نے تعاقب کر کے انھیں جالیا اور دوبارہ وہ جواہرات ان سے حاصل کر لئے۔ یہاں تک کہ وہ بیش قیمت الماس اور جواہرات جو اس کے پیشواؤں کے عماموں میں چھپے ہوئے تھے بلوچستان میں دوبارہ نادر شاہ کے ہاتھ آ گئے۔ اور ان کی مدد سے یہ سراغ بھی مل گیا کہ اصفہان میں دربار صفوی کا جو بہت بڑا جواہرتی خزانہ موجود تھا وہ اب یہاں منتقل ہو چکا ہے نادر شاہ نے وہاں کا رخ کر کے اس خزانہ کو بھی اپنی ملکیت بنالیا۔ نادر شاہ ان جواہرات کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھی گیا اور اس نے شاہ ہند محمد شاہ رنگیلے کو ایک خط لکھ کر بھیجا لیکن جب اس کے جواب سے اسے ناامیدی ہوئی تو اس نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا لیکن مصالحت ہو جانے کے نتیجہ میں جنگ بندی کے بعد اس نے ہندوستان کی حکومت دوبارہ محمد شاہ کے حق میں واگزار کر دی اور ایک سمجھوتے کے مطابق محمد شاہ نے کافی نقد، جواہرات، اسلحہ اور جنگی ساز و سامان نادر شاہ کی نذر کیا۔

اس سلسلے میں مال و خزانہ کا وہ بڑا حصہ جو نادر شاہ کے ہاتھ آیا تھا، ایران واپس نہ پہونچا بلکہ راستہ ہی میں اس کی "فیاضی" کی نذر ہو گیا۔ ایران واپس ہونے کے بعد جواہرات و نوادرات کی ایک قابل لحاظ تعداد نادر نے اپنی حکومت کے حکام اور ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں کو بطور تحفہ بھیج دئے۔ انھیں میں الماس و جواہرات سے مرصع وہ قیمتی اشیاء بھی شامل تھیں جو اس نے تحفہ کے طور پر سلطان محمود خاں بادشاہ ترکی، الیزابیت (ملیسا دتا) ملکۂ روس، ابوالفیض خاں امیر بخارا اور دوسروں کو بھیج دی تھیں۔ اس نے نفیس اور مرصع اشیاء کی ایک اچھی خاصی تعداد آستانۂ امام رضا

کی نذر کر دی اور کچھ چیزیں اپنے سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے ایک سردار احمد خاں ابدالی نے کچھ جانبازوں کو منظم کر کے نادر کے جمع کئے ہوئے جواہرات پر ہاتھ مارا۔ ایران سے باہر چلے جانے والے قیمتی جواہرات جو پھر کبھی یہاں واپس نہ آسکے جن میں "کوہ نور" ساری دنیا میں مشہور ہے۔ مذکورہ جواہرات مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے آخر کار سلسلۂ قاچاریہ کے بانی محمد خاں کی ملکیت بنے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ نادر شاہ کی وفات کے بعد ان جواہرات کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض محمد خاں کے ذمہ آگئے اور بعد میں اس کے برادر زادہ فتح علی خاں نے جو بذات خود جواہرات کا بڑا قدر شناس اور دلدادہ تھا۔ اس کی حفاظت اور نگہداشت کی، تخت نادری مشہور بہ تخت طاؤس اور تاج کیانی جیسے بیش بہا نوادرات بھی اس کی عملداری میں خاص توجہ کے مرکز بنے رہے۔ ناصر الدین شاہ کے دور سلطنت میں جواہرات جمع کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے کی کوششوں میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے مزید اڑتالیس (۴۸) ہیرے (گہرے زرد) خرید کر اپنی گوہر شناسی کا ثبوت دیا اور خزینۂ جواہرات سے اپنی دلچسپی اور علاقہ داری کی ایک مثال قائم کر دی۔ مظفر الدین شاہ اور محمد علی شاہ اپنے اپنے دور سلطنت میں ان جواہرات کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے رہے اس لئے انھوں نے ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کے انتظامات پہلے سے اور زیادہ سخت کر دیئے تھے۔

۱۳۱۶ شمسی میں رضا شاہ کبیر کے وضع کردہ ایک قانون کے مطابق مذکورہ خزینۂ جواہرات کو ایران کے قومی بینک کے سپرد کر دیا گیا۔ ۲۵/ آبان ۱۳۱۶ شمسی کے قانون کے تحت پہلے اس کو خزانہ موروثی اور بعد میں قومی دولت قرار دے کر مذکورہ بالا بینک میں محفوظ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد ۱۳۲۲ شمسی میں اس قومی خزانہ کو عوام کے دیدار کے لئے بطور نمائش رکھ دیا گیا لیکن جب اس خزانہ میں مزید جواہرات رکھنے کی گنجایش باقی نہ رہ گئی تو نئے خزانے کی تنزلین کے لئے مزید توسیع کی گئی۔

اس توسیع کے بعد ۱۳۲۴ شمسی میں جواہرات کے لیے ایک نئی عمارت کی تعمیر ہوئی اور ۱۳۲۹ شمسی کے اواخر میں اعلیٰحضرت محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ آریہ مہر کے دست مبارک سے اس نئی عمارت کا افتتاح ہوا۔ ۱۳۴۴ میں پہلی بار شاہی میوزیم ٹورنٹو (کناڈا) کے دانشوروں کی ایک ٹیم نے اس خزانۂ جواہرات کو آثار قدیمہ کا بیش قیمت علمی اور تحقیقی سرمایہ قرار دے کر اپنے تاثرات پر مشتمل ایک رپورٹ "جواہرات سلطنت ایران" کے نام سے شائع کی۔ یہ رپورٹ موجودہ دور میں ان بیش بہا جواہرات کے سلسلہ میں واحد معتبر اور باوثوق ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۳۴۶ شمسی میں ڈاکٹر مہدی بیانی نے مذکورہ جواہرات کے بارے میں ایک کتاب "جواہرات سلطنت ایران کی پانچ سو سالہ تاریخ" کے عنوان سے تالیف کی جو مرکزی بینک ایران کے توسط سے شائع ہو چکی ہے۔ ایرانی سلطنت کے ان بیش قیمت جواہرات کے بارے میں بہت کچھ تحریر کیا جا سکتا ہے لیکن ایک سوال جو تقریباً ہر ذہن میں نقش ہو چکا ہے اس کا جواب بہت مشکل ہے کہ آخر اس مجموعۂ جواہرات کی قیمت کیا ہے؟

کسی شخص کے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں ہے اس لئے کہ ایک دانہ کو خریدنے کے لئے کافی دولت درکار ہے پورے مجموعہ کا کیا سوال!

البتہ اس سوال کے جواب میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی سلطنت کا مجموعہ جواہرات بیش بہا نہیں بلکہ بے بہا ہے۔

دنیا بھر کے ملکوں میں اپنے خزانوں کو پوشیدہ رکھنے کی روایت عام ہے لیکن اس کے بالکل برعکس ایران کا شاہی خزانہ ایک نئی خصوصیت کا حامل اور اپنے طرز میں یکتا و بے مثال ہے۔

جواہرات کا یہ ڈھیر جس کی قیمت کا اندازہ لگانا عالم امکان کے حدود سے باہر جست لگانے کے مترادف ہے۔ اپنی انفرادیت، اہمیت اور بیش قیمت ہونے کی وجہ سے

نہ صرف وسط ایشیا بلکہ ساری دنیا کی نگاہوں کا محور و مرکز ہے۔ اس جواہراتی میوزیم میں یوں تو سیروں نہیں بلکہ منوں سونا، پلاٹینم، ہیرے، یاقوت، زمرد، موتی اور دوسرے جواہرات موجود ہیں۔ یہ ذخیرہ واقعتاً ناقابل شمار اور وزن کرنے کی چیز نہیں ہے اسی لئے اس کی تفصیلات کا ذکر بھی کافی فرصت اور فراغت کا کام ہے۔ ذیل میں "جواہرات سلطنت ایران" میں سے چند نمایاں اور قابل ذکر اشیاء کا ذکر اور ان کی خصوصیات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا جس کی مدد سے اُن کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ دنیا کے جواہرات میں ان کا درجہ کیا ہے۔ میوزیم میں سیکڑوں الماریاں ہیں۔ موجودہ ملکہ فرح پہلوی کی بہنوں نیز شہزادیوں کے استعمال کے لئے جس مقدار میں پلاٹینم، سونا اور جواہرات محفوظ ہے ان کا جواب نہیں۔ ویسے ہر الماری بلکہ ہر الماری کا گوشہ قابل دید اور قابل توجہ ہے۔ انھیں الماریوں کے چند گوشوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جا رہی ہے۔ اور ان میں محفوظ بیش قیمت جواہرات کے بارے میں جتنی معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کا ذکر ذیل کی سطروں میں مقصود ہے۔

تخت طاؤس (تخت نادری)

عام طور پر مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ ۱۷۳۹ عیسوی میں نادر شاہ تخت طاؤس اور جواہرات جڑے ہوئے تختوں کے علاوہ اور بہت سی بیش قیمت چیزیں ہندوستان سے اپنے ساتھ ایران لایا تھا۔

یورپین محققین کا قول ہے کہ نادر شاہ نے مذکورہ تخت طاؤس کا ہم پلہ ایک دوسرا تخت اسی قدر زر و جواہرات کی مدد سے تیار کروایا تھا لیکن اس تخت کی تیاری، موجودگی یا اس کے آثار کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لہٰذا مورخین کا حتمی خیال ہے کہ نادر شاہ کے قتل (۱۷ ویں صدی عیسوی) کے بعد یہ تخت ایران کے

ہندوستانی عورت کے "سستی" ہوجانے پر انھوں نے بڑے اچھے انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

چوں زن ہندو، کسی در عاشقی دیوانہ نیست
سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اسی طرح وہ مثنوی "ہشت بہشت" میں اپنے ہم سفر عازمین حج کو سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہم وطن ہندو برہمن کے جذبات اور خیالات کی بھی قدر کریں جو عقیدت و ارادت میں اپنے سینے کے بل پر" پرکرما کرتا ہوا سومنات" کے مندر پہونچتا ہے۔

خسرو کے دل میں وطن دوستی کا جذبہ ہمیشہ موجزن تھا۔ انھوں نے دہلی میں اپنی عمر عزیز کے چھیاسٹھ (۶۶) سال گزارے۔ وہ دلّی کے چپے چپے سے عشق حقیقی رکھتے تھے اور اپنے کلام میں بھی جابجا دلّی کی تعریف کی ہے۔ وہ اسے ہندوستان کے دوسرے شہروں پر فوقیت دیتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی مختلف نظموں میں بھی کیا ہے۔ مجموعۂ "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں انھوں نے دلّی کو "محراب اسلام"، "قبلۂ شاہ ہفت اقلیم" اور "جنت الفردوس" کے نام سے یاد کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور تصنیف "خزائن الفتوح" میں شہر کے خوبصورت ذخیرۂ آب "حوض شمسی" کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے (یہ حوض سلطانی بھی کہلاتا تھا)۔ شہر کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے سلطان التمش نے (۶۳۷ھ مطابق ۱۲۳۹ء) میں یہ حوض تعمیر کرایا تھا۔ جہاں سے شہر کے لوگوں کو

ہاتھوں سے نکل گیا۔

موجودہ تخت طاؤس حالانکہ نادر شاہ کے نام سے منسوب اور تخت نادری کے نام سے مشہور ہے لیکن اصلاً اسے نادر سے کسی قسم کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس طرح کے مسلمہ دلائل موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ تخت فتح علی شاہ قاچار کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ اس تخت پر جو تحریریں موجود ہیں ان کی رو سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ تخت فتح علی شاہ سے نسبت اور علاقہ رکھتا ہے۔ فتح علی شاہ کے اس تخت کو تیار کروانے کے سلسلہ میں دو مقاصد تھے اوّل تو اپنے دربار اور ہموطنوں کی شان اور شوکت میں اضافہ کرنا اور دوئم غیر ملکی سفیروں اور شاہی مہمانوں کو اپنے شاہانہ کروفر سے متاثر کرنا معلوم ہوتا ہے۔ شاہ مذکور نے غیر ملکی حکمرانوں، شاہزادوں، وزیروں اور سفیروں وغیرہ سے ملاقات کے لئے تہران کے قریب ایک گرمائی محل کی تعمیر کروائی تھی اور موجودہ تخت اسی محل کی زینت تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بارہ علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور وقت ضرورت ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس تخت میں آویزاں جواہرات کی کل تعداد ۲۶۷۳۳ ہے۔ موجودہ شہنشاہ ایران اعلیٰ حضرت ہمایوں محمد رضا شاہ پہلوی نے اپنی تاج پوشی کے وقت اسی تخت کا استعمال کیا تھا۔

تاج کیانی

فتح علی شاہ قاچار کا تاج ۔ تاج کیانی کے نام سے مشہور ہے جس پر ہیرے، زمرد، یاقوت اور موتی کا جڑاؤ کام ہے۔ یہ تاج فتح علی شاہ کے زمانے میں بنا تھا اور سلاطین قاچاریہ کے سروں کی زینت رہا۔ یہ پہلا تاج ہے جو ساسانیوں کے دور حکومت کے بعد اس شکل و صورت میں تیار کیا گیا تھا۔

دریائے نور

دریائے نور ایک مشہور ہیرا ہے جو شاید ایران کے شاہی جواہرات میں اوّل مقام کا حامل ہے۔ دریائے نور اور کوہِ نور اپنے ناموں کی مناسبت کے اعتبار سے ایک ہی قبیلے کے دو ہیرے شمار کئے جاسکتے ہیں حالانکہ اپنی تراش خراش اور رنگ و وضع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ یہ دونوں جواہرات نادر شاہ سے متعلق ہیں لیکن کوہِ نور نادر کے انتقال کے بعد احمد شاہ درّانی کے توسط سے افغانستان سے لایا گیا۔ احمد شاہ کے بعد شاہ شجاع کو منتقل ہوا اور شاہ شجاع کی شکست کے بعد مشہور ہندوستانی سردار "مہاراجہ رنجیت سنگھ" ملقب "شیرِ پنجاب" کی ملکیت قرار پایا۔ اس کے بعد یہ ہیرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ لگ گیا اور انھیں کے ذریعہ انگلستان کے دربار تک پہونچ کر ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ یہی ہیرا موجودہ ملکہ الزبیتھ کی ماں کے تاج میں آویزاں کیا گیا۔

دریائے نور نام کا ہیرا نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے پوتے شاہ رُخ مرزا کے ہاتھ لگا، پھر امیر علم خاں کے ہاتھوں ہوتا ہوا لطف علی خاں زند کے خزانے کی زینت بنا۔ جس وقت لطف علی خاں زند نے محمد خاں قاچار سے شکست کھائی۔ دریائے نور قاچاری خزانے میں داخل ہوگیا۔

ناصر الدین شاہ قاچار کو یقین تھا کہ یہ نگینہ کوروش بزرگ (ایران کے اوّلین حکمراں) کے تاج میں آویزاں ہیروں میں سے ایک تھا، شاید اسی لئے وہ اس ہیرے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ کبھی جوش عقیدت میں وہ اسے اپنی دستار میں سجاتا تھا اور کبھی سینے پر آویزاں کرلیتا تھا۔ اس نے دریائے نور کی حفاظت کے لئے چند مخصوص عہدیدار مقرر کئے تھے اور شاہی حکومت کے کچھ لوگوں کو اس کی دیکھ بھال کی خصوصی ذمہ داری سونپی تھی۔

دریائے نور بعد کو شاہی میوزیم کی ملکیت بن گیا اور اب تک تمام سلطنتی جواہرات کی عزت اور آبرو بنا ہوا ہے۔ مذکورہ ہیرے کا وزن ۱۸۲ قیراط ہے اور اپنے رنگ کے اعتبار سے کوئی دوسرا ہیرا اس کا ثانی اور ہمسر نہیں قرار پا سکتا۔

۱۳۴۴ شمسی میں، جبکہ ایران کے شاہی جواہرات کو شناخت اور شمار کرنے کے لئے کناڈا کے ماہرین کی ایک ٹیم کو مدعو کیا گیا تو اس ہیرے کے اصل جوہر کھلے اور اس پر خاطر خواہ توجہ کی گئی۔

فرانس کے مشہور جواہر شناس اور سیاح تاورنیہ نے اپنی کتاب میں اس ہیرے کو ۲۸۲ قیراط کا قرار دیا ہے اور اس بات کا اشارہ کیا ہے کہ اس نے مذکورہ ہیرے کو ۱۶۴۳ء میں مشرق میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے اپنی کتاب میں اس کا نام (DIAMOND GRAND TABLE) ہیرا یا بڑی تختی قرار دیا ہے اور اس کی شکل و صورت کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ مذکورہ ہیرے نے اپنی شکل اور وضع کے اعتبار سے کناڈا کے ماہرین کی توجہ اپنی طرف یوں منعطف کرالی کہ اب ان کا یہ عقیدہ ہے کہ "دریائے نور" اور "نور العین" دونوں دراصل پہلے ایک ہی ہیرے کی شکل میں تھے لیکن بعد میں اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ بڑے ٹکڑے کا نام "دریائے نور" پڑ گیا اور چھوٹا ٹکڑا جو صرف ۶۰ قیراط وزن ہے "نور العین" کے نام سے مشہور ہوا یہ ہیرا موجودہ دور میں ملکۂ ایران علیا حضرت فرح پہلوی کے نیم تاج کے درمیان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منصب درخشندہ ہے۔

کلاہ عباس مرزا

قاچاریہ عہد کے مشہور سردار عباس مرزا کی کلاہ مع جبہ کے جس پر کلابتوں اور سچے موتیوں کا کام ہے اور دوسرے جواہرات سے بھی آراستہ ہے۔

کلاہ عباس مرزا بالکل تاج کی شکل میں ہے، سرخ اطلس اور مخمل کے

کپڑے سے بنی ہے اور اس پر جابجا موتی جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپری حصّہ پر ایک بڑا زمرّد مع ایک ہیرے کے سونے کی کٹوری میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کلاہ عباس مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار کے لئے مخصوص تھی جسے وہ رسمی آئین اور سلامی کے موقع پر استعمال کرتا تھا۔

کرۂ جواہر نشاں

کرۂ جواہر نشاں کو سادہ الفاظ میں گلوب کہا جا سکتا ہے۔ یہ گلوب ۱۲۹۱ ہجری میں ناصر الدین شاہ قاچار کے حکم سے مکمل ہوا تھا۔ جسے ایران کے مشہور جوہریوں نے ابراہیم مسیحی کی نگرانی میں ۲۴ کلو سونا اور ۳۶۵۶ گرام جواہرات سے تیار کیا تھا۔

گلوب پر ۳۶۶/۵۱ سے زیادہ جواہرات نصب ہیں۔ جواہرات کے مختلف رنگوں سے دنیا کے مختلف ممالک کی نشاندہی کرنا خاصہ مشکل کام ہے لیکن اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان جوہریوں کو جغرافیائی نقشہ کشی پر بھی کافی حد تک عبور حاصل تھا۔ گلوب پر دریاؤں کی نشاندہی زمرّد کے ذریعہ کی گئی ہے اور خشکی کو یاقوت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا، ایران اور برطانیہ ہیروں سے، ہندوستان یاقوت سے، اور مرکزی و جنوبی افریقہ نیلے رنگ کے یاقوت سے نمایاں کئے گئے ہیں۔ خط استوا اور دوسرے جغرافیائی خطوط ہیروں کی مدد سے بنائے گئے ہیں۔

اس گلوب کا قطر ۶۶ سنٹی میٹر (تقریباً دو فٹ) ہے۔ اس کے پائے سونے کے ہیں جن پر جواہرات آویزاں ہیں۔

فنجان یاقوت

آرائش اور زینت کے ساز و سامان میں فنجان یاقوت بھی بڑی اہم اور

نادر چیز ہے - یہ ہندوستان کا بنا ہوا ایک پیالہ ہے جو ایک بہت بڑے یاقوت کو تراش کر بنایا گیا ہے اور سونے کی بنی ہوئی کرسی پر رکھا ہے۔

تاج پہلوی

یہ تاج سونے اور چاندی سے بنا ہوا ہے - بہترین ہیرے اعلیٰ قسم کے ہر لیان شوخ رنگ کے زمرّد، آسمانی رنگ کے یاقوت اور بیش قیمت موتیوں سے اس کی تزئین و آرایش کی گئی ہے تاج کی زمین سرخ مخمل کی ہے اور سر کلاہ ایک بڑا زمرد اس طرح نصب ہے جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر جکڑ رکھا ہو۔

تاج پہلوی، ہر لحاظ سے ہو بہو قدیم ساسانیوں کے تاجوں سے مشابہت رکھتا ہے جن کے مرکزی حصّے میں کنگرہ کے نیچے چمکتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کو جگمگاتے ہوئے زرد رنگ کے ہیروں کی مدد سے نمایاں کیا گیا ہے۔ کنگرہ کی پشت پر پائیدار طرّہ اور اس کے پیچھے بطخ کے پر لگے ہوئے ہیں۔ تاج میں جڑے ہوئے جواہرات کی تعداد اور ان کے اوزان حسب ذیل ہیں:

۳۳۸۰	عدد ہیرے	بہ وزن	۴۴۱ قیراط
۵	عدد زمرّد	بہ وزن	۱۹۹ قیراط
۲	عدد یاقوت کبود	بہ وزن	۱۹ قیراط
۳۶۸	عدد مروارید	(سچے موتی)	

ہیرے جواہرات، سونے اور مخمل سمیت مذکورہ تاج کا وزن ۴۴۴ مثقال (دو کلو اسی گرام) ہے۔

قاچاریوں کے دور حکومت میں بادشاہوں کی تاج پوشی کے وقت "تاج کیانی" استعمال ہوتا تھا، لیکن رضا شاہ کبیر نے اپنی تاج پوشی کے وقت اس سے استفادہ نہیں کیا۔ انھیں کے حکم کے مطابق ۱۳۰۴ شمسی میں تفقاز کے مشہور جوہری سراج الدین

اور امیر بخارا کے خاص جوہری (جو کہ روس سے ہجرت کر کے ایران آیا تھا) نے باہمی تدبیر سے خزانے کے خاص جواہرات کو منتخب کر کے "تاج پہلوی" تیار کیا۔

یہ تاج اب تک رضا شاہ کبیر اور ان کے فرزند ارجمند موجودہ شہنشاہ آریہ مہر اعلیٰ حضرت ہمایوں محمد رضا شاہ پہلوی کے جشن تاج پوشی میں استعمال ہوا ہے۔

جبہ تاجگزاری

یہ ایک ابریشمی جبہ ہے، جس کی سفید زمین پر گہرے رنگوں کے طلائی اور جواہراتی بوٹے کڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے حاشیے کے طور پر چھ سینٹی میٹر پہنائی میں موتیوں اور زردوزی کا عمدہ کام ہے۔

یہ جبہ (NW 09) رضا شاہ کبیر کی تاج پوشی کے لئے خصوصاً تیار کروایا گیا تھا۔ موجودہ شہنشاہ نے بھی اپنی تاج پوشی کے موقع پر اس کو پہنا۔ اس میں آویزاں موتیوں کا وزن ۳۶۶/۳۱ مثقال ہے۔

تاج شہبانو فرح

علیا حضرت فرح پہلوی ملکہ ایران کا تاج ۱۳۴۶ ہجری میں خزانے میں موجود جواہرات سے بنایا گیا تھا۔ یہ تاج پلاٹینم کا ہے اور اس میں قیمتی پتھروں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۱/۴۶۹	دانے	برلیان
۳۶	〃	زمرّد
۲	〃	لعل
۳۴	〃	یاقوت
۱۰۵	〃	موتی

نیم تاج زمرد

یہ نیم تاج پلاٹینم (WHITE GOLD) کا بنا ہوا ہے اور ۳۲۴ عدد چھوٹے بڑے بریلیانٹ سے آراستہ ہے۔ ان میں سے ایک ہیرا جو نسبتاً کم رنگ اور بہ اعتبار وزن ساٹھ (۶۰) قیراط "نورالعین" کے نام سے مشہور ہے، اس تاج کے درمیان میں نصب ہے۔ جس کی وجہ سے تاج کی چمک دمک دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

جقۂ نادری

ہیرے اور جواہرات سے آراستہ نادر شاہ کا طرۂ دستار، جس کے درمیان ایک نفیس بیش قیمت اور خوش رنگ زمرد آویزاں ہے۔ اس طرّہ کے نچلے حصّہ میں تین امرودی زمرد لگے ہوئے ہیں۔ طرہ کا بالائی حصّہ ہفت پہل ہے اور دو پہلوؤں پر ہیرے سے پھول اور پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان پہلوؤں کی نوک پر دو اعلیٰ قسم کے امرودی زمرد جڑے ہوئے ہیں۔ درمیانی بڑے رنگ کے اوپر ہیروں سے چاند کی شکل بنائی گئی ہے اور نیچے دو طرف جھنڈے، نقارے، توپ اور نیزے کی دھار کو سونے کے کام سے نمایاں کیا گیا ہے۔ جھنڈے کے کپڑے کو ذرا ہلکے رنگ کے زمرد، یاقوت اور ہیروں سے تین لائنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پورہ طرہ جگمگاتے ہوئے ہیروں اور خوش رنگ چمکتے ہوئے جواہرات سے آراستہ ہے۔

شمشیر جہانکشائی نادری

اس شمشیر کو سونے سے بنایا گیا ہے اور بمعنی شمشیر قطعاً ناقابل استعمال ہے

جس کا مقصد غالباً صرف آرایش اور نمایش ہے۔ اس کا دستہ نہایت مزیّن اور قابل دید ہے، غلاف پر ۸۶۹ اچکدار اور جھلاتے ہوئے ہیرے نصب ہیں اور اس کی پشت پر فتح علی شاہ کی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ تصویر کے نیچے "السلطان فتح علی شاہ قاچار" اور ذیل کے دو مصرعے خط نستعلیق میں کندہ ہیں:

این تیغ جہان گشا کہ کان گہر است
گردون قتال را ہلال نفر است

رباعی کے دیگر دو مصرعے بھی دوسری طرف سے جھلکتے ہیں۔ قبضہ کے دونوں طرف فتح علی شاہ قاچار کے فرزندان اور کامران مرزا کی نیم تنی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن کے ارد گرد میناکاری کی مدد سے سورج اور پھول پتیوں کی شبیہیں بنی ہوئی ہیں۔

شمشیر کے غلاف کی پشت پر فتح علی شاہ کے درباری نقاش اور میناساز عبداللہ کی بھی تصویر بنی ہوئی ہے جس نے اس کی ترتیب اور تزئین کی ہے اور اس کے نیچے یہ قطعہ درج ہے:۔

این چہرہ کہ در طراز شاہنشاہ است
تمثال یکی چاکر کار آگاہ است
تا آب بقا بنوشد از کام است
افتادہ بدستہای شاہ عبداللہ است

غلاف کے نچلے حصّہ پر شکاریوں کی ایک جماعت کو نقاشی اور میناکاری کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے، اس کام میں بھی بارہ (۱۲) جگمگاتے ہوئے ہیروں کا استعمال ہوا ہے۔

یہ تلوار ایران کے سلطنتی اسلحہ جات میں نمایاں اور "شمشیر جہان کشائی نادری" کے نام سے مشہور ہے۔ نادر شاہ کی جہاں کشائی سے یہ تلوار دوسرے

ہیرے جواہرات کے ساتھ خزانۂ ایران کی زینت بنی ہوئی ہے۔ صرف تاج پوشی کے وقت یہ تلوار بادشاہوں نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی کمر میں لگائی ہے شہنشاہ ایران رضا شاہ کبیر نے بھی اپنی تاج پوشی کے وقت اس سے استفادہ کیا تھا۔

شمشیر انگلستان

یہ شمشیر مخمل کے غلاف کے ساتھ ہے جس کا دستہ سونے کا ہے۔ ہیرے زبرجد اور موتی کے دانے اس پر جابجا نصب ہیں۔ شمشیر پر جواہرات سے ایک انگلستانی تاج بنا ہوا ہے اور انگریزی حروف V.R. (وکٹوریہ) کندہ ہیں۔ مذکورہ شمشیر ملکہ وکٹوریہ نے ناصر الدین شاہ قاچار کو تحفۃً پیش کی تھی۔

شمشیر ترکیہ

چاندی کے غلاف سے ڈھکی ہوئی شمشیر جس کے قبضہ پر ہیرے کا کام ہے۔ یہ شمشیر رضا شاہ کبیر (پہلوی سلطنت کا موسس) کی تاج پوشی کے وقت حکومت ترکی نے نذر کی تھی۔

شمشیر روسیہ

شمشیر بہ غلاف و رشوار GERMANSILVER جس پر جابجا سونے کا کام ہے۔ اس کا قبضہ سونے اور ہیرے کا بنا ہوا ہے۔
مذکورہ تلوار رضا شاہ کبیر کی تاج پوشی کے موقع پر حکومت روس نے پیش کی تھی۔

تاریخ آزادی ہند

ٹھنڈا اور میٹھا پانی میسر ہوتا تھا۔ عوام کے لئے اس دور کے بادشاہ اسی طرح سرائے حوض اور کنویں وغیرہ بنوا دیا کرتے تھے جس سے عام طور پر مسافر وغیرہ اپنی ضرورت کے مطابق سہولیات حاصل کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں ہندوستانی سلاطین کے دور میں جابجا ملتی ہیں۔ خسرو کی ایک اور تصنیف "اعجاز" میں "اودھ" (ایودھیا) کے باغات، اشجار، پھل، پھول، اسے کے باشندوں کے اخلاق و آداب وغیرہ کے خصائل بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں انھوں نے اپنے مزّی اور ممدوح سلطان کیقباد کی مصاحبت میں کچھ دن گزارے تھے اور اچھا تاثر حاصل کیا تھا جسے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہے۔ "قران السعدین" (جو کہ "مثنوی در صفت دہلی" کے نام سے بھی منسوب کی جاتی ہے) میں خسرو نے بنگال کی نفیس باریک ململ اور یہاں کے نازک بدن لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ خسرو نے شہر دیوگیر (دولت آباد) اس کے کپڑے اور موسیقاروں کی تعریف و ستائش کرتے ہوئے اپنے مجموعہ "نہایت الکمال" میں الفاظ و معانی کو اپنی آخری حد پر پہونچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنے زور قلم کے بدولت اس تاریخی شہر کا ایسا جامع اور مبسوط نقشہ کھینچا ہے کہ اس کی اصل تصویر نگاہوں کے سامنے پھر کر رہ جاتی ہے۔ دیوگیر مختلف اقسام کی مصنوعات کے ذکر کو انتہائے کمال تک پہونچانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

امیر خسرو کا شاہکار ان کی مثنوی "دول رانی و خضر خاں" ہے جو ازاول تا آخر ہندوستانی ماحول اور فضا کی زائیدہ اور پروردہ ہے۔ یہ مثنوی "عشقیہ" "آغاز عشق" اور "مثنوی شاہی" کے ناموں سے بھی مقبول ہے۔ جو گجرات کے راجہ کرن دیو کی نازک اندام و پری پیکر بیٹی دول رانی اور علاؤالدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کے عشق کی داستان کے طور پر خسرو نے تخلیق کی تھی۔ یہ مثنوی طربیہ اور

●

مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم آزاد ہندوستان میں سانسیں لے رہے ہیں اور ہم نے غلامی کا وہ دور نہیں دیکھا جب ملک کی آزادی کے لئے کچھ سوچنا، کہنا اور بولنا ۔ غداری کا دوسرا نام تھا۔ کیا ظلم اور زیادتی کی بات تھی کہ ۔ ملک ہمارا ۔ سرزمین ہماری ۔ اس سرزمین کو سینچنے والا خون ہمارا ۔ لیکن ہمارے ہی ملک پر حکومت کسی اور کی ۔ اور اُس پر ۔ یہ الگ کہ زبان بند رکھئے ۔ کچھ مت کہئے ۔ کچھ نہ بولئے ۔ بالکل خاموش رہئے ۔

مگر اس کے بعد بھی ملک کے لئے کہے جانے والے غدار اور آزادی کے سپاہیوں نے کسی بھی زمانے میں اپنی زبان بند نہیں کی ۔ اور ۔ وہ آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھتے تھے ۔ وہ اسے صاف صاف کہنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ سزا، جیل اور دوسری تکلیفیں سہنے کے بعد بھی ان کی زبان سے یہی نکلتا رہا ؎

بنایا تھا ہم کو جنھوں نے غلام ۔۔۔ ہمارا کیا ہر طرح قتل عام
دبایا تھا گولی کی بوچھار سے ۔۔۔ ڈرایا تفنگ اور تلوار سے
کبھی ہم کو لوٹا بنام وفا ۔۔۔ وفاؤں کا بدلہ جفا سے دیا
کبھی بے سبب دل دکھایا گیا ۔۔۔ کبھی ہم کو نیچا دکھایا گیا
تعصّب کا فتنہ اٹھایا گیا ۔۔۔ ہماری زباں کو سٹایا گیا

خطاکار کون اور خطا دار ہم
ستم کون ڈھائے سزاوار ہم

ہم اہل وطن ہو کے مجبور تھے
جو حاکم تھے انصاف سے دور تھے

حقیقت کبھی اک داستاں بن گئی
ہماری وفا امتحاں بن گئی

کبھی زہر ہم کو کھلایا گیا
کبھی قحط بنگال ڈھایا گیا

کبھی شہریاروں پہ بھی قید و بند
کبھی اہل دانش پہ پھینکی کمند

کبھی تاجداروں کو رسوا کیا
کبھی ذی وقاروں کو رسوا کیا

کبھی تو مٹانے کی تدبیر کی
کبھی مسخ کی شکل تقدیر کی

چھپانا تھا مظلوم کی چیخ کو
تو نوچا کھسوٹا ہے تاریخ کو

کبھی نوجوانوں کو زد میں لیا
کبھی جاں نثاروں کو حد میں لیا

کبھی تو نہتوں پہ گولی چلائی
کبھی بے سہاروں کی موڑی کلائی

یہ کوشش کوئی سر اٹھانے نہ پائے
تمنا کوئی مسکرانے نہ پائے

کہیں جل نہ پائے کسی کا چراغ
لگے روئے برطانیہ پر نہ داغ

گھٹاؤں سے سورج نکلنے نہ پائے
"اہنسا کی تحریک" چلنے نہ پائے

فرنگی حکومت بدلنے نہ پائے
کسی کا کوئی وار چلنے نہ پائے

غرض امن کے یار خطرے میں تھے
وطن کے وفادار خطرے میں تھے

صداقت پہ لب کھولنا جرم تھا
حقیقت پہ کچھ بولنا جرم تھا

شرافت خطا، بے بسی جرم تھی
وفادار کی زندگی جرم تھی

فضاؤں پہ چھایا ہوا تھا غبار
گھٹن اس قدر تھی کہ سب بیقرار

گھٹن منصفی کی طلب گار تھی
ہواؤں کو آزادی درکار تھی

وطن میں اک آندھی یکایک اٹھی　　فضا ہند کی کچھ بدل سی گئی
جو غاصب تھے آپس میں لڑنے لگے
درخت اپنی جڑ سے اکھڑنے لگے

دعائیں اثر سے بچھڑنے لگیں
امارت کی کرچیں اکھڑنے لگیں

اکھڑنے لگی حق فروشوں کی ساکھ　　فضاؤں میں اڑنے لگی ان کی راکھ
شب و روز چولے بدلنے لگے　　خود اپنی چتاؤں میں جلنے لگے
چتاؤں کے شعلے جو بڑھنے لگے　　قدم غاصبوں کے اکھڑنے لگے

بہت ہی برا تھا بھگوڑوں کا حال
پھنسے تھے یہ جس میں انھیں کا تھا جال

اسی وقت ہندی سپاہی اٹھے　　لئے فقر میں بادشاہی اٹھے
اٹھے ہر طرف سے جیالے اتھے　　بلاؤں سے بھی لڑنے والے اٹھے
اٹھے سورما، ویر، بانکے جوان　　ترنگے کو اپنا بنا کر نشان
اٹھے سنت، صوفی، مہنت اور فقیر　　اٹھے ہر طرف سے غریب و امیر
جو سوئے تھے بیدار ہونے لگے　　لڑائی کو تیار ہونے لگے

سبھی جاگ اٹھے آن کی آن میں
لڑائی ہوئی جم کے میدان میں

جنگ کی اس حالت میں لڑنے والے سپاہی تو ہر طرف سے لڑ رہے تھے لیکن زبان اور قلم کی لڑائی لڑنے والے بھی اب زبان و قلم کو چھوڑ کر اپنے ہاتھوں میں تلوار لے کر وطن کے سپاہی بن کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے سر سے کفن باندھ کر یہ نعرہ لگاتے ہوئے نکلے ؎

وطن کا سپاہی بڑھا جا رہا ہے
ترانے محبت کے وہ گا رہا ہے
وطن کا سپاہی ....

ہوائیں ہوں، طوفاں ہوں، یا آندھیاں ہوں
گھٹائیں ہوں، بارش ہو، یا بجلیاں ہوں

یہ اپنی ہی دھن میں مٹا جا رہا ہے
وطن کا سپاہی ....

سناتا ہے گیت ایکتا کی دھنوں میں
گرفتار ہے پیار کے بندھنوں میں

محبت کے نغموں کو دہرا رہا ہے
وطن کا سپاہی ....

یہ امن اور اہنسا کا سنگم رہا ہے
سدا بھائی چارے پہ قائم رہا ہے

ہمیشہ ہزاروں میں یکتا رہا ہے
وطن کا سپاہی ....

وطن کا سپاہی بڑھا جا رہا ہے
ترانے محبت کے وہ گا رہا ہے
وطن کا سپاہی ....

کہیں زور شمشیر حضرت محل — کہیں پر تھا رضیہ کے بازو کا بل
کہیں پر چمکدار شمشیر تھی — کہیں امن کی کوئی تدبیر تھی

بھگت سنگھ، اشفاق و بسمل اٹھے
تمناؤں کے حوصلے کھل اٹھے

اٹھے پرچم امن لے کر سبھاش — تشدد کی ہستی ہوئی پاش پاش
اٹھا ایک سے اک زمانہ شناس — پہن کر سیاست کا "جنگی لباس"
اٹھے سرفروش اور اٹھے جاں نثار — اٹھے اپنی دھرتی کا لے کر وقار

کوئی زور تلوار لے کر اٹھا
کوئی امن اور پیار لے کر اٹھا

وہ گاندھی اٹھے، وہ جواہر اٹھے — وہ آزاد، قدوائی، جوہر اٹھے
غرض ہر طرف سے اٹھا اک مہان — مہک اٹھا پھولوں سے ہندوستان

سیاہی فضا میں بھٹکنے لگی
کرن روشنی کی چھٹکنے لگی

اٹھا ہر طرف سے نیا انقلاب
دکھا پھر اندھیرے میں اک آفتاب

جے جے ہندوستان — جے جے ہندوستان

آزادی کا شور اٹھا ہے بستی اور ویرانوں سے
پیار کے نغمے ابل رہے ہیں پربت اور چٹانوں سے
گونج رہا ہے دیش کے کونے کونے میں یہ گان

جے ۔ جے ۔ ہندوستان

تو نے جب سے اپنایا ہے امن کی مشکل راہوں کو
قدرت نے سلوت بخشی ہے تیری تیز نگاہوں کو
امن پسندوں کی نظروں میں تو ہے عالیشان

جے ۔ جے ۔ ہندستان

گونج رہا ہے اتحاد کے نغموں کی آوازوں سے
امن کی دیوی جھانک رہی ہے ظلمت کے دروازوں سے
جاگ اٹھا ہے گاندھی کے خوابوں کا ہندستان
جے - جے - ہندستان

آخر وہ وقت قریب آگیا جب ہمارا پیارا ملک ہندوستان آزاد ہونے کے قریب آگیا اور سامراجی حکومت آزادی کے سپاہیوں کی للکاروں سے لرزنے لگی ؎

گرہ سے ستارے کھسکنے لگے — فرنگی کے چہرے مسکنے لگے
غلامی کی مدت گزرنے لگی — کلائی سے زنجیر ترنے لگی
وہ پیروں کی بیڑی بھی کٹنے لگی — ترقی کی سوغات بٹنے لگی
لڑے ہم اہنسا کی تلوار سے — ملی فتح ہم کو بڑے پیار سے
ارادے نئے حوصلے پا گئے — ترنگے فضاؤں میں لہرا گئے

چلو راونوں کے بجاری گئے
تماشا دکھا کر مداری گئے

ہندوستان کے گلی کوچے اپنے انگریز حاکموں سے آزاد ہو گئے اور ہندستان کا بچہ بچہ اپنی آواز میں اپنے وطن کی آزادی کے گیت گانے لگا ؎

خزاؤں کی ہستی مٹائیں گے ہم
ہنسیں گے کبھی گیت گائیں گے ہم

بہاروں پہ چھایا ہوا ہے سرور
فضاؤں پہ آیا ہوا ہے سرور
نظر میں سمایا ہوا ہے سرور

اسی ساز پر گنگنائیں گے ہم
ہنسیں گے کبھی گیت گائیں گے ہم

وفا اور ایثار کے سائے میں
محبت کی دیوار کے سائے میں
خلوص، امن اور پیار کے سائے میں

اہنسا کا پرچم اٹھائیں گے ہم
ہنسیں گے کبھی مسکرائیں گے ہم

ہمارے وطن کا یہی ہے نظام
عقیدت کا آئے گا جب بھی مقام
جبینِ عقیدت کرے گی سلام

عقیدت سے سر کو جھکائیں گے ہم
ہنسیں گے کبھی مسکرائیں گے ہم

آزادی کی خوشیوں میں سرمست و سرشار بوڑھے، بچے اور جوان اپنے روشن اور تابناک مستقبل کے تانے بانے تیار کرنے لگے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ان کی نگاہیں آنے والی نسلوں پر جم کر رہ گئیں۔ آزاد ہندوستان کی فضائیں حوصلوں اور ولولوں کی پھول مالائیں لئے ہر گزرگاہ پر ان کے استقبال کے لئے دو رویہ کھڑی تھیں اور ملک کے پس منظر سے کچھ ایسے نغموں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی جو ملک کے مزدور کسان، محنت کش، سرحدوں کے محافظ غرضکہ ہر دھڑکتے ہوئے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔

چل چل رے نوجوان:
چل چل رے نوجوان:

اونچا ترا نشان
دھرتی کے آسمان
ہر سمت تیری دھوم
ہر سمت تیری شان
ہندوستاں کے دل
ہندوستاں کی جان
تو بھی عظیم اور تیرا دیش بھی مہان
چل چل رے نوجوان !
اب تیرے خواب کا
حاصل قریب ہے
طوفاں ہے تجھ سے دور
ساحل قریب ہے
دو چار گام اور
منزل قریب ہے
ہاں تیرے ساتھ دیش کے مزدور اور کسان
چل چل رے نوجوان !
بڑھنا ہے لازمی
ہشیاریوں کے ساتھ
آسائشیں بھی ہیں
دشواریوں کے ساتھ
کانٹوں کا ہے وجود
گلکاریوں کے ساتھ

بس ایک گیت، ایک ترانہ ہو، ایک گان
چل چل رے نوجوان !
چل چل رے نوجوان !!

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی آزادی کی لڑائی میں جن لوگوں نے اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کی روح کی تسکین کے لئے ہمارے دلوں سے بے ساختہ دعاؤں کا ایک چشمہ ابل پڑا ؎

ہوئے تھے جو راہ وطن میں نثار — ملا آتماؤں کو ان کی قرار
جو دھرتی کی خاطر ہوئے تھے شہید — منائیں وہ جنت میں خوشیوں کی عید
وہ دُوت امن کے، شانتی کے امام — انھیں کو ملے گی حیات دوام

بنام عقیدت یہی ہے پیام
وطن کے شہیدوں کو میرا سلام

اٹھاؤ ہاتھ دعاؤں کا اہتمام کرو
اٹھو وطن کو عقیدت سے پھر سلام کرو
اٹھو دلوں میں وفا کی امنگ لے کے اٹھو
اٹھو خلوص و محبت کا رنگ لے کے اٹھو
ہر ایک جاگ اٹھے ایسی ترنگ لے کے اٹھو
اٹھاؤ ہاتھ دعاؤں کا اہتمام کرو
اٹھو وطن کو عقیدت سے پھر سلام کرو
خلوص و امن کا رنگ اور ابھی نکھرنے دو
مرے وطن کو ابھی اور کچھ سنورنے دو
ہر ایک کو یہی پیغام عام کرنے دو
اٹھاؤ ہاتھ دعاؤں کا اہتمام کرو
اٹھو وطن کو عقیدت سے پھر سلام کرو

ہندوستان کا اوّلین "ملک الشعراء"

المیہ دونوں قسم کی شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں سوز و گداز، جوش و خروش اور جادو بیانی اپنے پورے عروج شباب پر ہے۔ مذکورہ مثنوی میں دو محبت بھرے دلوں کی جاں سوز واردات قلبی اور مہجور عاشقوں کی ایک ایسی المیہ کہانی ہے جس میں تجسس، تحیّر، فنی محاسن اور زبان و بیان کی رنگارنگی سے نئی جان ڈالی گئی۔ مذکورہ مثنوی کے علاوہ "مثنوی نہ سپہر" خسرو کی ان نمایاں اور منفرد تصانیف میں شمار ہوتی ہے جو ہندوستان کے ماحول، تہذیب و تمدن اور یہاں کی زبان کے اعتبار سے بھی اور ادبی و فنی حیثیت سے بھی ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔ سرزمین ہند کے گوشے گوشے سے اپنی بے پناہ عقیدت اور شیفتگی کے اظہار کے لئے انھوں نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں کی سوندھی مٹی سے نکلنے والی بھینی بھینی خوشبو نے انھیں ایسا مرعوب اور متاثر کیا کہ وہ یہاں کے گرویدہ ہو کر رہ گئے۔ "مثنوی نہ سپہر" میں نو باب مختلف عناوین کی تعریف و توصیف میں لکھے گئے ہیں اور ہر باب میں علاحدہ علاحدہ بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن زیر نظر مثنوی کا تیسرا باب صرف ہندوستان کی سرزمین، یہاں کے عوام، تہذیب و تمدن نیز مناظر قدرت سے متعلق ہے۔ وہ ہندوستان کو تمام دنیا کے مقامات سے اعلیٰ گردانتے تھے اور یہاں کی تمام چیزوں کے مدّاح اور توصیف گزار تھے۔ انھوں نے مذکورہ مثنوی میں ہندوستان کی اہمیت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ اور اس کی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لئے کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان میں جملہ علوم و فنون نے دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔ یہاں مختلف خطّوں سے لوگ تحصیل علوم کے لئے آتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کر لینے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اس ملک

شوری شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

سولھویں صدی کے ابتدائی سال میں شاہ اسمٰعیل اول (۱۵۰۴ — ۱۵۲۴ء) نے ایران میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ یہ دور ایران کی تاریخ میں ایک امتحانی دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے حکمراں سرحدی اور اندرونی خطروں کے تدارک میں اس قدر مصروف تھے کہ شعراء اور ادباء کی سرپرستی تو درکنار انھوں نے ان کی باقاعدہ حوصلہ شکنی شروع کر دی تھی۔ اور ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ شاہ اسمٰعیل کا بیٹا شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ — ۱۵۷۶ء) بھی اپنے پیش رو کی طرح غیر ملکی حملوں اور اندرونی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی قوت بڑھاتا رہا۔ اس نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں ادب نوازی اور قدردانی کا ثبوت دیا۔ اور شعراء کو نوازا لیکن وہ جلد ہی مذہب اور علمائے مذہب سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا کہ اس نے تمام شعراء پر پابندی عائد کر دی وہ بادشاہوں اور امیروں کی شان میں مدحیہ قصائد کے بجائے صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد کہا کریں۔ مذہبی شاعری کے علاوہ ہر قسم کی شاعری پر پابندی عائد ہو گئی۔ ان حالات میں ایرانی شعراء اور ادباء اپنے وطن میں گھٹن کا احساس کرنے لگے۔ اور بقول بدایونی بظاہر شاید یہی سب سے بڑا سبب تھا کہ ایک سو ستر[۱۷۰] نامور

ایرانی شعراء اسی دور میں ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے۔ [۱]

ہندوستانی ادب نوازی، داد و دہش اور قدر دانی کا سلسلہ صرف مغل حکومت تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ امراء اور دکن کی خود مختار ریاستوں میں بھی ادب پروری اور شعر نوازی کا دور دورہ تھا۔

علی عادل شاہ اپنی ادبی سرپرستیوں کے لئے دکن کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ مرزا محمد قاسم "تاریخ فرشتہ" میں صدائے زن ہیں [۲]

"سادات و علماء و فضلاء را گرامی داشتہ و ارباب معین کرد ہمگی ہمت آں گزرانید کہ مردم خوب در درگاہش جمع شوند۔ لہٰذا در اندک فرصتی از ایران و توران و سائر اقالیم سبع مردم خوب تشریف آوردہ بیجاپور رشک ربع مسکون گردید و علی عادل شاہ کہ بہ ارشاد رسیدہ بود تعظیم کردہ ہمیں می شد در اندک مدت بر خلق پاشید"

ابراہیم عادل شاہ نے بھی فیاضی اور سرپرستی کی یہ عادت اپنے چچا اور پیشرو علی عادل شاہ سے ورثہ میں پائی تھی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی تو اپنی قدر افزائیوں کی وجہ سے ایران تک بہت مشہور تھا۔ اس نے ادب اور اس کے متعلقین کی اعلیٰ پیمانہ پر سرپرستی کی اور انہیں ہر طرح سے نوازا۔ وہ بڑا ہی عادل، نیک طینت اور خوش مزاج حکمراں گزرا ہے اس کی انہیں خوبیوں اور خصائل سے متاثر ہو کر سنجر کاشانی نے اس کی تعریف میں کہا ہے۔

دو شاہ شاعر پرور بلند نام شدند
نخست والیٔ غزنین دوم خدیو دکن

۱۔ منتخب التواریخ۔ ۳۴۳ مرتبہ سر سید احمد خاں

۲۔ تاریخ فرشتہ (مرزا محمد قاسم) ۲۵ روضہ ۲۔ مقالہ ۳۔ ۳۵

رسد بہ عہد تو شاعر بہ پایۂ مسکیں --- زہے نوازش شاہ وزہے ظہور سخن

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنے دربار میں بہت سے نامور ادبا اور شعرا کو جمع کیا۔ انھیں حسب مراتب انعامات واکرامات سے نوازا اور صلہ وجاہ ومناصب کی داد ودہش میں کوئی کمی باقی نہ رکھی۔ اس کے دربار میں بہت سے نامور شعراء ایران بھی موجود تھے۔ جن میں ملک قمی اور ظہوری ترشیزی کے نام صف اوّل کے فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ فیضی نے اکبر کو اسی سلسلے میں تحریر کیا تھا۔ ؎ :

" دراحمد نگر دو شاعر خاکی نہاد وصافی مشرب اند و در شعر مرتبۂ عالی دارند، یکی ملک قمی کہ بکیس کمتر اختلاف می کند و ہمیشہ مرتبۂ تری دارد و دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگینی کلام است "

گو کہ دکن کی تاریخ ایسے عادل اور فیاض حکمرانوں کی تعریف سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے شعرا اور ادبا کو ہر موقع پر زر وجواہرات سے نوازا۔ لیکن وہ فیاضیاں اس پیمانے پر نہ تھیں جیسی کہ مغل سلاطین کے درباروں میں تھیں۔ اور جن کی توقع لیکر مذکورہ ادبا اور شعرا نے سرزمین ایران کو خیرباد کہہ کے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ غالباً اسی لئے ظہوری نے اپنا مشہور "ساقی نامہ" برہان نظام شاہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ برہان نظام شاہ کو حالانکہ ادب وشاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وہ ظہوری کے "ساقی نامہ" سے اس قدر متاثر ہوا کہ بعد میں خزانے سے لدے ہوئے کئی ہاتھی اسے تحفہ کے طور پر دئے۔ اور اسکی قدر افزائی کی۔ اس قسم کی ادب نوازی کا سکہ جاری تھا اور یہ ادب نوازی ہندوستانی تہذیب اور درباری روایت کا جز بن چکی تھی۔ یہ صرف دکن تک محدود نہیں تھی بلکہ سارے ہندوستان میں یہی حال تھا۔

ہندوستان کی تاریخ ادبی سرپرستیوں اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔

؎ سرو آزاد (غلام علی آزاد) ۳۲

سلاطین کے درباروں کے علاوہ امراء اور رؤسا نے اپنی فیاضیوں کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً دکن کا نام اس زمرہ میں سرفہرست آتا ہے اس لئے کہ اس کے حکمرانوں نے شعراء اور ادباء فضلاء، علماء اور فصحا کا ایران سے مراجعت کرنے کے بعد سرزمین ہندوستان پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے استقبال کیا۔ اور خصوصاً ان ایرانی اہل علم و دانش کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع حاصل ہوا۔ جو سمندری جہازوں سے سفر کرکے ہندوستان آئے اور سب سے پہلے سرزمین دکن نے انھیں خوش آمدید کہا۔ غالباً اسی وجہ سے علمی سرپرستیوں اور ادب نوازیوں کے سلسلے میں دکن کا نام ہندوستانی تاریخ میں سرفہرست نظر آتا ہے۔ شمالی ہندوستان اور دوسرے مقامات پر ایران سے آنے والے ادباء اور شعراء نے کچھ نہ کچھ قیام دکن میں ضرور کیا ہے اور دکن کے قیام کے دوران وہ دوسرے ادب پرور رئیسوں اور امیروں کے مرکز نظر بنے رہے۔ ان میں سے کچھ دکن ہی میں رچ بس گئے اور کچھ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جاکر قیام پذیر ہوئے اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کرکے قبولیت خاص و عام حاصل کی۔ یہی شعراء مغل سلاطین کے دربار کی بھی رونق اور زینت بنے اور سلاطین مغلیہ کے درباروں سے وابستہ امراء و رؤسا کے درباروں میں بھی انھوں نے رسائی حاصل کی جہاں پر ان کی مناسب قدر و منزلت ہوئی اور مال و جواہرات سے بھی نوازا گیا۔

جب فارسی شاعری اپنے وطن ایران میں زبوں ہوگئی اور اس کی ساکھ گرنے لگی۔ اسی دور میں ہندوستان میں یہ اپنے پورے عروج کمال پر پہونچ چکی تھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کا بول بالا تھا۔ دانشمندوں اور مربیوں نے اس کی ترویج و بقا کے سلسلے میں ہر ممکنہ امداد کیلئے اپنی رضامندی دے دی تھی اور ہر طبقہ کی طرف سے اس کا استقبال کیا گیا تھا۔ تصوف جو کہ فارسی شاعری کا خاصہ ہے اب ہندوستانی ذہنوں میں بھی سرایت کرچکا

تھا۔ شہنشاہ اکبر جو بذات خود علم کا دلدادہ اور سرپرست تھا۔ تصوف کی اس لہر میں ڈوب کر سرشار ہوگیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح اور فتحپور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیم رح سے والہانہ عقیدت کا جذبہ دراصل اس کے دل میں اسی وقت پیدا ہوا تھا۔ غرضکہ ہندوستان میں علم پروری اور ادب نوازی کا سکہ جاری تھا۔ اور علوم کا کوئی شعبہ سرپرستوں اور مربیوں سے خالی نہیں تھا۔ اس دور کی شاعری صرف زر و جواہر کی متداول ہی نہیں بلکہ بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں فارسی شاعری نے جو فروغ پایا — اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور دستیاب نہیں ہوتی مغل دربار کے علاوہ بھی بیشتر امراء اور رؤسا میں ایسے اشخاص شامل تھے۔ جو شعراء اور ادباء کو وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے تھے اور ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھتے تھے۔

مغل دربار اکبر کے زیر سرپرستی منبع علم بنا ہوا تھا۔ حکیم ابوالفتح گیلانی، عبدالرحیم خان خاناں اور ملک الشعراء فیضی جیسی بلند قامت شخصیات کی دلچسپیوں کی وجہ سے فارسی شاعری کو روز افزوں عروج حاصل ہو رہا تھا۔ دراصل ان دانشوروں نے ہندوستان میں فارسی شاعری کی جڑیں مضبوط کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزالی اور عرفی جیسے باکمال شاعر جو اپنے وطن میں معیاری شاعر کی حیثیت سے شہرت نہ حاصل کر سکے ہندوستان آئے — اور یہاں آنے کے بعد ان کی شاعری پر نکھار آیا۔ جب ان کے ذہنوں سے آلام و مصائب کا غبار چھٹا تو فکر اور تخیل نے انگڑائی لی۔ اور انھوں نے معیاری شاعری اور اعلیٰ تخلیقی ادب کے بے شمار نمونے اپنے شاہکاروں کی شکل میں چھوڑے ہیں۔ صاحب "مآثر رحیمی" عبدالباقی نہاوندی نے ان اصحاب علم و دانش کی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر تنقید کرتے ہوئے اپنے

تذکرہ میں لکھا ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں کے دربار کے سلسلہ میں ان کی تحریر ذیل میں نقل کی جارہی ہے ۔۔ (مآثر رحیمی ۔ جلد ۳ ص ۲۹۳)

"اکثر ازاعیان دولت و ارکان سلطنت بادشاہ مرحوم دست گرفتہ و تربیت کردہ وی اند۔ ہر کہ از ولایت آمدہ بندگی و مصاحبت ایشان اختیار نمودہ چنانچہ خواجہ شنائی و میرزا قلی میلی، و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی سائر مستعدان در خدمت او بودہ اند، و مستعدان و شعر سنجان این زمان را اعتقاد آن است کہ تازہ گوئی کہ درین زمان در میانہ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی، مولانا عرفی شیرازی وغیرہ بآن روشن حرف زدہ اند، بہ اشارہ تعلیم وی بودہ"

شاہی دربار کی سرپرستی اور فیاضی کے ساتھ ساتھ دربار سے منسلک امرا اور رؤسا نے بھی ذاتی طور پر اپنے درباروں میں فارسی ادب اور شاعری کو جتنا فروغ دیا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی ۔ ان امراء نے جو بذات خود بڑے عالم اور صاحب کمال گزرے ہیں ۔ نیز دربار اکبر میں اپنے علم و دانش کی بنا پر بڑے بڑے بلند قامت جاہ و مناسب پر مامور ہوئے ۔ الگ الگ ایک دربار کی حیثیت بھی رکھتے تھے اور ان سب کے درباروں میں علیحدہ علیحدہ بھی علم و ادب کی شمعیں جگمگا رہی تھیں ۔ عبدالرحیم خان خاناں، ملک الشعراء فیضی، خان اعظم میرزا عزیز، خان زماں علی قلی خاں اور حکیم ابوالفتح گیلانی جیسے باکمال اور علم دوست امرار اکبر کے دربار کی ادبی اور تہذیبی روایات کے روح رواں تھے ۔ جن کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کی ادب نوازی اور علم پروری کے ڈنکے دور دور تک بج رہے تھے۔ ان امرار نے بہت سے ایرانی شعرار کا استقبال کیا۔ اور ان کے کمالات کے عوض انہیں خوب نوازا ۔ صرف خانخاناں کے دربار پر نظر ڈالی جائے تو شعر و ادب کا ایک منبع وہاں سے برآمد ہو گا۔ اس زمانے کے مشہور شعراء ملا نجیبی عرفی، نظیری و ظہور خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھے اور اسی کی سرپرستی

کے طفیل گلشن ایران کے یہ پھول ہندوستان میں بھی خوب پھلے اور اپنی خوشبو سے سارے گلشن ہندوستان کو معطر کر دیا۔

وطن ترک کر کے سرزمین ایران سے ہندوستان آنے والے پھولوں کے گلدستے میں مشہور شاعر غزالی مشہدی بھی شامل ہے جو شاہ طہماسپ کی تنگ دلی اور بیجا زور دستی سے تنگ آکر اولاً دکن ہوا۔ دکن سے خان خاناں علی قلی خاں کی دعوت پر جونپور آیا اور خان زماں کی سرکوبی اور قتل کے بعد دربار اکبری سے منسلک ہو گیا۔ جہاں بعد میں "ملک الشعراء" کے اعلیٰ ترین درجے تک پہونچا۔ تاریخی شواہد سے واضح ہے کہ غزالی مشہدی سے دربار اکبری میں پہلی بار ملک الشعرائی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد فیضی، طالب آملی اور کلیم ہمدانی وغیرہ اس فہرست میں شامل ہیں۔ غزالی مشہدی کی اسی تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر اس کی حیات، شخصیت اور اس کے فکر و فن کا جائزہ لینا اس مقالہ کا موضوع ہے۔

شعر و ادب کی دنیا جتنی حسین، نفیس اور رنگا رنگ ہے اتنی ہی غم گین، پر ملال اور حادثوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اگر کچھ عناصر اپنی تعمیری قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنے ہم عصروں کے نام و نمود کے لاتعداد چراغ روشن کرتے ہوئے پائے گئے ہیں تو وہیں انھی کے بالکل برعکس کچھ ایسے عناصر کا وجود بھی ناگزیر ہے جنھوں نے اپنے عصر اور ہم عصروں کے ساتھ قطعی انصاف نہیں کیا ہے انھوں نے صرف اس سلسلے میں بے انصافی ہی نہیں برتی ہے بلکہ ادبی دیانتداری کو دوسروں کی نظروں میں مشکوک کر لیا ہے شعر و ادب کی دنیا میں ہر فن کار ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے اپنا خون جگر صرف کرتا ہے۔ پھر بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ شہرت اور اعترافات کے معاملے میں اپنے ہم عصروں سے بازی لے ہی

جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ شاعر یا ادیب جسے اس کے ہم عصروں نے نظر انداز کر دیا ہے اسے ادب میں کوئی مقام قطعی حاصل ہی نہیں یا اس کا کوئی مرتبہ ہی نہیں ہے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کو پرکھتے وقت اس کی تخلیقات کی عظمت کو نظر انداز کر کے اسے اس کے ذاتی یا عصری پیمانے سے ناپا جائے۔ زیر نظر شاعر غزالی مشہدی کا بھی انہیں شعرا میں شمار کیا جا سکتا ہے جسے اس کے ہم عصروں نے نظر انداز کیا اور تعجب و تاسف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شاعر کی زندگی اور اس کے زندہ جاوید فن کا عنصر ہی ایک المیہ ہے جو اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے غزالی مشہدی کے فن کے بارے میں تو اس کے کلام کے ذریعہ سے خاطر خواہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اس کی شخصیت اور ابتدائی زندگی سے متعلق اس کے عہد کے تذکرہ نگار خاموش اور بے نیاز ہیں پھر بھی قرائن اور آثار کے اعتبار سے گمنام اور کم شہرت یافتہ شخصیتوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جانا ناگزیر ہے۔

ذیل میں غزالی کے ابتدائی حالات زندگی کی ایک مبہم سی تصویر قرائن اور آثار کے ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس امر کا بہر حال خیال رکھا گیا ہے کہ جن ذرائع سے معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ تاریخی شواہد کے اعتبار سے قابل اعتنا ہوں۔

مختلف تذکروں کی ورق گردانی کے بعد غزالی نام کے انیس[۱۹] شاعروں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ غزالی بلخی، غزالی طوسی، (زین الدین) حجۃ الاسلام محمد بن محمد غزالی طوسی (مجدالدین)، غزالی ماوراء النہری،

غزالی جنبک مشہدی، غزالی سمرقندی، غزالی (نظام محمود طاہر)
مروزتی، میر اسلام غزالی، غزالی تبریزی، غزالی ہروی، غزالی (ازملا
معتمد الدولہ منوچہر خاں)، غزالی تحوری، غزالی نوکری، غزالی خجندی، غزالی
ابہری، غزالی ابخدانی، غزالی مشہدی (علی رضا) اور غزالی مشہدی
لیکن ہمارا مقصد آخر الذکر یعنی غزالی مشہدی کی ذات سے بحث کرنا ہے
اسی مقصد کی تکمیل کے لیے غزالی کے ابتدائی حالات زندگی کی تلاش میں
ماضی کے دریچوں کو کھولا جا رہا ہے۔

غزالی کے معاصرین تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی اس کے نام کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ متاخرین میں بھی کشن چند اخلاص کے علاوہ سب اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں غزالی کا نام علی رضا مشہدی لکھا ہے۔ لیکن غزالی کے عہد سے تقریباً ۱۵۶ سال کے بعد لکھے جانے والے اس تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اخلاص کو غزالی کے نام کے متعلق یہ معلومات کس ذریعے سے فراہم ہوئیں جبکہ "سفینہ خوشگو" کے مصنف نے اپنی تصنیف میں علی رضا غزالی کا باقاعدہ ذکر کر کے اس کے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں اور قدرت اللہ گوپاموی نے "نتائج الافکار" میں علی قلی خاں سے وابستہ غزالی مشہدی کے ذکر کے فوراً بعد علی رضا غزالی کا ذکر اور اس کا کلام بھی درج کیا ہے جس کی مدد سے علی رضا اور غزالی مشہدی دو الگ الگ شخصیتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اور غزالی مشہدی کا نام بھی پردہ اخفا ہی میں رہتا ہے۔

غزالی کے دوسرے حالات زندگی کی طرح اس کے سنہ ولادت اور والدین کے بارے میں بھی کسی تذکرہ نگار نے کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے خود غزالی نے اپنے کلیات کے دیباچے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے

اس سے اس کے والدین کا نام یا ان کی اصلیت کے سلسلے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ایک مفروضہ سن ولادت ضرور مل جاتا ہے۔

برٹش میوزیم، لندن میں محفوظ قدیم فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے وقت کلیات غزالی کے ضمن میں غزالی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور یورپی محقق اور مستشرق ڈاکٹر ریو نے اس کا سن پیدائش ۹۳۶ھ قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ریو کی ادبی و تحقیقی دیانت پر قطعی شک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزالی نے اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں خود بڑے دلچسپ اور دلکش پیرایہ میں انکشاف کیا ہے۔ اس ضمن میں ذیل کے مندرجہ اشعار بھی اسی کلیات میں شامل ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (۹۳۳ھ میں پیدا ہوا تھا۔ [۱]

درین مدینہ پس از ہجرت رسول امین
گزشتہ نہصد و سی و سہ از شہور سنین
بشہر بد حدوث آمدم ز ملک قدم
بدین حقیقت حوادث زاوج علیین

غزالی کی جائے پیدائش کے بارے میں خود اس کے دونوں دواوین کے علاوہ دوسرے مستند اور معتبر ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ صوبۂ خراسان کے شہر مشہد مقدس میں پیدا ہوا تھا اور مذہب اثنا عشری سے متعلق تھا۔ تقی اوحدی نے اپنے تذکرے میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

[۱] کلیات غزالی (دستنوشت) موزۂ برطانیہ (لندن) ورق ۸۹

نے دوسرے ممالک کو دیکھتے ہوئے فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی۔ شطرنج (بازی) اور صفر (ہندسہ) کی ایجاد بھی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ ویدجیسی مقدس اور قابل قدر تصنیف بھی یہیں کا خاصہ ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور موسیقی کا ایک گنج گراں مایہ ہے۔ سرزمین ہند ہی پر "پنچ تنتر" کی تکمیل عمل میں آئی (جس کا فارسی، عربی اور ترکی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے) اور ہندوستان کی مدح وستائش کرنے کی سب سے آخری اور اہم وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے کہ یہاں کی سرزمین پر خسرو جیسا شیریں بیان اور سحر طراز شاعر پیدا ہوا۔

واقعی شیریں بیان اور سحر طراز شاعر مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں پھر خسرو جیسے صاحب فن اور جامع کمالات جو علم وادب، شعر وفن اور غناء موسیقی کے علاوہ دیگر مروجہ علوم وفنون پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں کہیں صدیوں بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں جو صدیوں تک اپنے علم وفن کی روشنی سے دنیا کو منور اور روشن رکھتے ہیں۔ اور جن کی ذات سے دنیائے ادب میں پرانے چراغوں سے نئے چراغوں کے جلنے کا سلسلہ روز اوّل سے آج تک جاری ہے۔

خسرو کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا فن زوال اور لافانی قدروں کا ایک حسین مرقع ہے۔ خسرو کے کلام کا ایک بڑا حصہ حب وطن، باہمی اتحاد، قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے موضوعات سے متعلق ہے جس کی چند منتخب مثالیں گزشتہ سطور میں درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے وطن دوستی کے موضوعات پر مشتمل اشعار کی تعداد چونکہ خاطر خواہ اور تسلی بخش ہے اس لئے زیر نظر کلام کی روشنی میں ان کی اس قسم کی شعوری یا غیر شعوری کوششوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جس کے ذریعہ انھوں نے ادب کو عوامی اتحاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کا وسیلہ بنایا۔

خسرو کے ہم عصر اور متاخرین دونوں ان کی عظمت، اہمیت اور انفرادیت

"مولانا غزالی از مشہد مقدس مطہر رضویہ است"[1]

غزالی نے بذات خود مشہد مقدس کی سرزمین پر اپنی پیدائش کی نہ صرف اطلاع دی ہے بلکہ اسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ اس پاک اور مقدس سرزمین کا زائیدہ اور پروردہ ہے جس کی عظمت اور تقدیس کا سارا عالم معترف ہے۔ مشہد مقدس سے متعلق ہونے پر غزالی ہی کیا کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی اپنی ذات کو خوش قسمت تصور کر کے خود پر فخر کر سکتا ہے۔ غزالی کا مندرجہ مطلع اس کے جذبات کا مظہر ہے[2]

در کارگاہ چرخ اگر نیک و بد منم
ایں دولتم بس است کہ از خاک مشہدم

زیر بحث شاعر غزالی مشہدی کی تعلیمی اسناد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ وہ کن مدرسوں یا اداروں میں زیر تعلیم رہا، کتنی تعلیم حاصل کی۔ استاد کون کون تھے۔ اس کے طالب علم ساتھیوں میں خاص کون تھے یہ سارے سوالات تشنۂ معلومات ہیں۔ لیکن اس کی تعلیمی استعداد کی عظمت کے بارے میں مشکوک نظریہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔ غزالی کے کلام کا بیشتر حصہ اس کے علم عمیق اور فن کارانہ پختگی کا مظہر ہے۔ قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، مثنویات، ترجیع بند سب کے سب سنجیدہ اور رنگین عنوانات پر مشتمل ہیں اور علم حکمت کے نادر نکات سے بھرپور ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی ہجویات بھی فنکارانہ گہرائیوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مثنوی "نقش بدیع" اور ساقی نامہ دونوں تصوف اور عرفان کے باب میں ایک گراں قدر اضافے کے طور پر تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ان نثری کارناموں کو بھی قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن کے ذریعہ سے غزالی مشہدی

---

[1] عرفات العاشقین (تقی اوحدی) صفحہ ۵۲۰ (ج) [2] صفحہ دیباچہ دیوان آثار الشباب، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، مرتبہ

عوام و خواص سے متعارف ہونے کی منزل سے یہ کہ ان میں مقبول اور معروف ہونے کی منزل تک روز افزوں ترقی کے آسمانوں کی سیر کرتا نظر آتا ہے ۔ اس کے ذہن کی رفعت پرواز سے یہ امر بہر حال ظاہر ہے کہ وہ مروجہ علوم سے پوری طرح مالا مال تھا۔ غزالی کی علمی اور فنی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صاحب ہفت اقلیم امین احمد رازی نے لکھا ہے[1]

" مولانا غزالی بفضائل و کمالات صوری و معنوی محلّی بود "

ملا بدایونی کے علاوہ سارے تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ غزالی کا شمار اپنے دور کے اول درجے کے شعرا میں ہوتا ہے اور شائد یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر تذکروں میں اس کی شاعری کے عروج و شباب اور اس کی شاعرانہ عظمت کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس کی شاعری کی ابتدا کہاں ، کیسے اور کب ہوئی ! یہ ایک باقاعدہ سوال ہے جس کے جواب میں مندرجہ ذیل سطور حاضر خدمت ہیں ۔

غزالی کی ابتدا شاعری کے ضمن میں معتبر ذرائع سے رابطہ قائم کرنے کے بعد صادقی کتابدار کے قول پر غور کیا جا سکتا ہے اور اسی قول کی روشنی میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے نہ صرف شعر و شاعری سے منسلک تھا بلکہ کم عمری میں ہی باقاعدہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا۔ صاحب تذکرہ مجمع الخواص صادقی کتابدار کی تحریر ملاحظہ ہو[2]

" در اوائل عمر شاعر شناختہ شد و چون نوری و ندائی را ہجو گفت شہرتی بسزا یافت "

تذکرہ نگار موصوف نے صاف طور پہ بتایا ہے کہ وہ اوائل عمری ہی میں بحیثیت شاعر متعارف اور مشہور ہو گیا تھا اور اس کی صلاحیتیں اپنے ہم عصروں پر سبقت لے جانے میں پوری طرح صرف ہو رہی تھیں۔ مذکورہ ہجو کی

---

[1] تذکرہ ہفت اقلیم - امین احمد رازی ص۱۱۷ [2] تذکرہ مجمع الخواص صادقی کتابدار خدا بخش لائبریری پٹنہ ص۱۳۸

اس کی اس جد وجہد کی مثال ہے۔

غزالی کے دیباچہ دیوان آثار الشباب میں بھی کوئی واضح اطلاع اس کی ابتدائی شاعری سے متعلق نہیں ملتی۔ اس کے دیباچہ دیوان میں نثری تحریر کے دوران ایک قطع اس مضمون کا ضرور ملتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص غیر شعوری طور پر یا کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ بذات خود نہایت غور و فکر کے بعد منتخب کیا ہے وجہ تخلص میں بھی حسن نظر جمالیاتی احساس اور خود بینی کے عناصر شامل ہیں۔[1]

غزالی شد غزال گوئی شعارم
بوصف طلعت یوسف جمالان
چو آہو بودہ ام از خورد سالی
سگ آہوی چشم خورد سالان
غزالی بہر آن کردم تخلص
کہ دیدم مرکھا از غزالان

مندرجہ بالا قطعہ کے مفہوم سے واضح ہے کہ اپنا شمار غزل گویوں میں کرتے وقت غزالی ذہنی طور پر جمالیاتی احساس کے ہجوم میں اس قدر کھویا ہوا ہے کہ اس کے قدم انکساری اور خلوص حسن کی انتہائی سرحدوں کو چھو رہے ہیں۔ اس نے اپنا تخلص غزالی صرف اس لئے منتخب کیا کہ اسے انسانوں میں حسن خلوص اور لطیف احساس جمال کا شائبہ نظر آرہا تھا۔

ظاہر ہے کہ غزالی نے جب اوائل عمر سے شاعری کی باقاعدہ ابتدا کر دی تھی اور کچھ ہی عرصے میں اسے اپنے ہم عمروں میں شہرت بھی حاصل ہو گئی تھی تو یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص بھی ابتدائے شاعری ہی میں منتخب کیا ہوگا اس لئے کہ اس کے ابتدائی

---

[1] دیوان آثار الشباب (غزالی مشہدی) صد ۱۵

کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائے شاعری سے دورِ انتہا تک وہ اپنے اس تخلّص کو برابر استعمال کرتا آیا ہے۔ اس کے تخلص بدلنے کی کوئی روایت یا کوئی واقعہ کہیں درج نہیں ہے۔

غزالی کے معاصر و عہد قریب کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ایران کے شاہی دربار سے وابستگی کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ صاحب مجمع الخواص کے بیان سے البتہ اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے کسی نہ کسی حیثیت سے متعلق ضرور تھا اور شاہ طہماسپ کے خوف سے اس نے مہاجرت اختیار کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی صادقی کتابدار کی درج ذیل عبارت اہم ہے[1]

" در زمان شاہ مرحوم تہمت زدہ اکا اندیشید و مہاجرت اختیار کردہ "

اس بیان سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ غزالی کا شاہ طہماسپ سے گہرا ربط تھا اور اس کا شمار دربار کی باعزت اور قابل قدر شخصیات میں ہوتا تھا۔ شاہ طہماسپ کے علاوہ ایران کے کسی امیر، وزیر یا رئیس کے دربار سے غزالی کی وابستگی کا اور کوئی حال نہیں معلوم، لیکن طہماسپ کے دربار سے اس کے تعلقات کے بارے میں ایک اور اہم شہادت ملتی ہے جس سے یہ بات واضح اور ثابت ہو جاتی ہے کہ قیام ایران کے دوران وہ خاصے عرصے تک شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا۔ غزالی کی پیدائش یعنی ۹۳۳ھ سے لیکر ۹۵۸ھ تک ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن ۹۵۸ھ میں شاہ طہماسپ کے حکم کی تعمیل میں خواجہ امیر بیگ بھی معزول و محبوس کی ہجو اور سرزنش کرنے کے لئے اس نے سفر شیراز اختیار کیا (اس کا ذکر پہلے بھی تفصیل سے آچکا ہے۔) اس وقت

۱؎ تذکرہ مجمع الخواص - صادقی کتابدار - خدابخش لائبریری پٹنہ ص ۱۳۸

غزالی کی عمر بائیس برس کی رہی ہو گی۔ کیوں کہ اس واقعہ کے فوراً بعد خود اس پر عتاب نازل ہوا اور مجبوراً اسے ترک وطن کرنا پڑا۔ اس لئے یہ زمانہ ایران میں اس کے فنی شباب کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ اپنی فنی صلاحیتوں سے دربار طہماسپ کی اہمیت میں اضافہ کر رہا تھا اپنی اس عمر سے پہلے وہ کسی اور دربار سے وابستہ ہو یا نہ ہو لیکن بائیس برس کی عمر کے بعد ہجرت کے وقت تک وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا اور اسی کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر عازم ہندوستان ہوا۔ آقائی سعید نفیسی نے اپنی تالیف میں غزالی مشہدی کے حالات زندگی اور امیر بیگ نجمی کی سرزنش کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کی ہے۔ آقائی نفیسی کے الفاظ ملاحظہ ہوں [۱]

" در سال ۹۵۸ھ غزالی در ارد وی شاہ طہماسپ بودہ شاہ اورا
نزد وی فرستاد کہ اشعاری در سرزنش وی بگوید۔ پس از آن کہ بہ
تہمت بدمذہبی خواستہ اند اورا آزار دہند۔ بہ ہندوستان رفتہ "

شاہ طہماسپ کے دربار میں غزالی پر کیا گزری اور اس نے ترک وطن کا فیصلہ کیوں کیا، پھر ترک وطن کر کے کن مرحلوں سے گزرتا ہوا دربار اکبر تک پہونچا اور کس طرح " ملک الشعرا " کے درجہ تک پہونچا اس کی تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

جیسا کہ اس مقالہ کے آغاز میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جس دور سے زیر نظر شاعر غزالی مشہدی کا تعلق ہے اس دور کے ایرانی حکمرانوں اور خصوصاً شاہ طہماسپ نے مذہب اور علمائے مذہب سے متاثر ہو کر شعرائے ایران کو واضح ترغیب دی تھی کہ وہ امراء و سلاطین کے بجائے صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد لکھا کریں۔ اس حکم کی خلاف ورزی

[۱] نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی۔ سعید نفیسی۔ خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ صفحہ ۴۱۴

کرنے والے معتوبی و معتوبی تک کی سزائیں پاتے تھے۔ مذہبی شاعری کے علاوہ تمام دروازے بند ہو جانے کی وجہ سے شعرائے ایران میں احساسِ کمتری بڑھنے لگا۔ اور وہ ہندوستانی درباروں کی فیاضیوں کا ذکر سن سن کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ملّا بداؤنی کے بقول شاید یہی سبب سے بڑا سبب تھا کہ ایک سو ستّر نامور ایرانی شعرا اس دور میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آگئے تھے۔

صاحب تاریخ عالم آرائی عبّاسی نے اس دور کے ایران کے بدلے ہوئے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے [1]

"مجملاً در زمان دولت همایون آن حضرت خلائق و عباد اللہ تقویٰ و پرہیزگاری بہ نوعی مبالغہ فرمودند کہ قصّہ خوانان و معرکہ گیران از اموری کہ در و شائبۂ لہو و لعب باشد ممنوع گشت"

بداؤنی اور اسکندر بیگ ترکمان کی تحریروں سے یہ بات طے ہو گئی کہ ایران کے ادبی حالات متزلزل ہونے کے سبب وہاں کے نامور شعرا بے قدری کا شکار ہو کر عازمِ ہندوستان ہو رہے تھے۔ انھیں نامور شعرا میں زیرِ بحث غزالی مشہدی بھی شامل ہے جو اولاً تو شاہ طہماسپ کے لشکر سے وابستہ رہا اور شاہانہ فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتا رہا۔ لیکن بعد میں طہماسپ کی نگاہوں سے اتر گیا اور اس کے لئے الحاد اور مذہبی بے اعتدالی کے الزام میں قتل کا حکم جاری ہو گیا۔ مجبوراً عراق سے براہ فارس، آبی راستے سے وارد ہندوستان ہوا۔ شروع میں کچھ دن دکن میں گزارے، پھر شمالی ہند کا رخ اختیار کیا اور بعد میں دربارِ اکبر میں ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا۔ ملّا بداؤنی مندرجہ ذیل واقعہ کے راوی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] تاریخ عالم آرای عباسی۔ اسکندر بیگ ترکمان تہران ایڈیشن صفحہ ۱۱۲۹

"چوں بہ تقریب الحاد و بے اعتدالی در عراق قصد کشتن او کردند از آنجا بدکن فرار نمود و پس بہند آمد ــــــ چند سال پیش خان زمان بود بعد از آن بملازمت پادشاہی رسیدہ خطاب "ملک الشعرا" یافت"[1]

علاؤالدولہ کامی نے "نفائس المآثر" میں اس واقعہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے[2]

"در فرصتی کہ ملا در دکن بود .... علی قلی خان یکہزار روپیہ خرچ راہ جہت ملا فرستاد .... و بعد از قتل علی قلی خان کہ چنانچہ مذکور شدہ است، باین درگاہ معلی آمدہ بعنایات پادشاہانہ سرافراز و ارجمند شد و بخطاب "ملک الشعرا" یافت"۔

اب سوال یہ ہے کہ ترک وطن کرتے ہوئے غزالی نے ہندوستان کی راہ کیوں اختیار کی اور سب سے پہلے دکن کا انتخاب کیوں کیا؟ اس سوال کا قطعی جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں غزالی کے حالات زندگی کی تفصیلات میں جانا ہوگا اور اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی حالات کا عمیق جائزہ لینا ہوگا کہ کیا شاعر مذکور کے سامنے کوئی ایسی خاص مجبوری تھی جس کے سبب اس نے اکبر اور امرا اکبر کے درباروں کو چھوڑ کر دکن میں پناہ لی یا یہ محض اس کی پسند تھی؟

ایران سے مراجعت کر کے ہندوستان آتے وقت غزالی نے دکن کو اپنی پہلی منزل کیوں بنایا اور وہاں سے فوراً ہی شمالی ہند کا رخ اختیار کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے وقت یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ایران کی ادبی زبوں حالی کی وجہ سے وہاں کے بیشتر ادبا و شعرا ترک وطن اختیار کر کے ہندوستان آرہے تھے۔ چونکہ اس دور میں ایران سے ہندوستان کا سفر کرنے کے لئے سمندر سے زیادہ محفوظ اور کوئی راستہ

---

[1] منتخب التواریخ۔ ملا بدایونی۔ فیگور لائبریری۔ لکھنؤ صفحہ ۱۷۱ [2] تذکرہ نفائس المآثر علاؤالدولہ کامی صفحہ ۵۳۵

نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کے بندرگاہ صرف دکن ہی میں تھے اور ان کا فاصلہ بھی جنوبی ایران سے بہت کم تھا۔ اس لئے ایران سے یہاں آنے والے لوگ لازمی طور پر پہلے دکن ہی میں وارد ہوتے تھے اور یہاں پہونچکر وہ دکن ہی کی کسی ریاست یا دربار سے چسپاں ہوجاتے یا پھر دکن سے شمالی ہند کا رخ اختیار کرتے تھے اور جہاں بھی ان کی قدر و منزلت ہوتی وہیں کے ہو رہتے۔ غزالی کا دکن آنا اسی لئے ناگزیر ہے۔ سمندری راستے سے اس کے ہندوستان کا سفر کرنے کی شہادت بھی ملتی ہے۔ صاحب "عرفات العاشقین" نے تحریر کیا ہے۔

"گویند چو از خراسان بعراق و فارس آمد از آنجا رغبت ہند فرمود، از راہ دریا بدکن افتاد"

غزالی کی زندگی کے ان ایام کے قیمتی حالات معلوم کرنے کی غرض سے مختلف تاریخوں اور تذکروں میں تلاش و جستجو کے باوجود کوئی ایسا ذریعہ نہیں مل سکا جس کی مدد سے یہ ثابت ہوسکتا کہ غزالی نے دکن میں کتنے عرصے تک قیام کیا اور اس عرصہ میں وہ کس حکمراں کے دربار میں رہا۔ نیز اس کی دکن میں کیا قدر و منزلت ہوئی۔ تمام ذرائع اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ تذکروں اور تاریخوں میں غزالی کا سفر ہند اور دکن میں قیام کا ذکر مختصراً ملتا ہے لیکن دکن کے قیام کے زمانے کے حالات بالکل نہیں ملتے ممکن ہے وہ دکن میں اپنے قدم نہ جما پایا ہو اور بے قدری سے عاجز آکر صوبیدار جونپور کی دعوت قبول کرنے پر مجبور ہوگیا ہو۔

علی قلی خاں صوبیدار جون پور نے غزالی کی دکن میں بے قدری

لہ ہفت اقلیم - امین احمد رازی - ٹیگور لائبریری - لکھنؤ ص ۴۱۷

کا حال سن کر اسے ایک ہزار روپیہ اور ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا [1]

ای غزالی بحق شاہ نجف
کہ سوئی بندگان من چون آئی
چونکہ بے قدر بودۂ آنجا،
"سرخود گیرو زود بیرون آئی"

چونکہ علی قلی خاں خود بڑا قابل اور ذی علم شخص تھا۔ اس نے اپنے فنی کمال کا مظاہرہ مندرجہ بالا قطعہ میں بھی کیا ہے۔ قطعہ کا آخری مصرع ہے۔

"سرخود گیرو زود بیرون آئی"

سرخود گیر..... غزالی کا سر..... یعنی عین..... برابر ایک ہزار اعداد..... جیسا کہ آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا اس دعوت کو غزالی نے قبول کر لیا تھا اور دکن سے فوراً شمالی ہند کا سفر اختیار کر کے جونپور کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں علی قلی خاں کی فرمائش پر اس نے اپنی مشہور مثنوی "نقش بدیع" تخلیق کی جس میں ایک ہزار اشعار تھے اور اسے ہر شعر پر ایک طلائی سکہ کے اعتبار سے ایک ہزار سکہ علی قلی خاں سے انعام کی شکل میں حاصل ہوئے تھے۔ وہ ایک مختصر مدت تک جونپور میں علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں کے ساتھ رہا۔ پھر علی قلی خاں کے قتل کے بعد اکبر کے دربار میں رسائی ہو گئی۔ غزالی کے تئیں علی قلی خاں کی سرپرستی کا سب سے پہلا واقعہ متعدد تذکروں کے حوالوں سے درج کیا جا چکا ہے۔ کہ اس نے ایک ہزار روپیہ گھوڑے اور دوسرے تحائف بھیج کر کس طرح غزالی کو دکن چھوڑ کر جونپور آنے پر مجبور کیا اور کس طرح غزالی نے دکن سے مراجعت کر کے شمالی ہند کا رخ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں مختلف التواریخ، عرفات عاشقین، ہفت اقلیم، مجمع النفائس،

[1] منتخب التواریخ - ملا بدایونی - نیگور لائبریری - لکھنؤ صفحہ ۱۷۰

، نفائس المآثر، ہفت آسمان، نتائج الافکار اور ید بیضا وغیرہ نے بیک زبان یہی کہا ہے کہ دکن میں غزالی کی بے قدری کا حال سن کر حاکم جونپور علی قلی خاں نے اسے دعوت نامہ بھیج کر اپنے دربار میں بلایا اور غزالی نے اس کی دعوت خندہ پیشانی سے قبول کرلی ۔ دعوت نامہ کے ساتھ جو مال ومتاع بھیجا گیا تھا وہ علی قلی خاں کی سرپرستی، فیاضی اور جذبۂ داد و دہش کی علامت تصور کیا جا سکتا ہے ۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ غزالی کے جونپور وارد ہونے کے بعد علی قلی خاں نے اسے بہت نوازا اور اس کے بھائی بہادر خاں کی نظر عنایت بھی غزالی پر رہی۔

صاحب عرفات عاشقین تقی اوحدی نے لکھا ہے [1]

"کتاب نقش بدیع بل گوہر شاہ دار وغیرہ اکثر در خدمت وصحبت ایشان شدن"

غزالی کی مثنوی "نقش بدیع" جو کہ نظامی کی مشہور مثنوی یعنی "مخزن الاسرار" کے طرز پر اسی وزن میں ہے، کے سلسلے میں تذکروں میں مرقوم ہے کہ یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ غزالی نے مذکورہ مثنوی اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خاں کی فرمائش پر تخلیق کی تھی اور اس کے ہر شعر پر ایک طلائی سکہ رائج الوقت کے اعتبار سے ایک ہزار طلائی سکے انعام کے طور پر حاصل کئے تھے ۔ صاحب ہفت اقلیم، امین احمد رازی نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے [2]

"غزالی سالہا بخان زمان بسر بردہ، نقش بدیع را در ان زمان بنظم آورد ودر عوض ہر بیتی یک طلائی صلہ یافت"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں ہفت اقلیم کے مندرجہ بالا اقتباس کی صداقت اور حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے

---

[1] عرفات العاشقین - تقی اوحدی - خدا بخش لائبریری - پٹنہ - صفحہ ۵۲ [2] ہفت اقلیم -

کے قائل اور معترف ہیں۔ جلیل شیراز، عرفی شیرازی نے خسرو کو طوطیٔ ہند کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان کی شیریں بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ہندوستانی شعراء کے سرخیل کے درجے نواز ا ہے ؎

بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کام طوطیٔ ہندوستان بود شیریں

(عرفی شیرازی)

اصل واقعہ کی تائید بھی کی ہے اور مثنوی "نقش بدیع" کے چند اشعار نقل کئے ہیں جو علی قلی خاں کی مدح میں ہیں۔

نقش بدیع کہ ہزار بیت است ، چو ہر بیت یک اشرفی صلہ یافت دریں کتاب مدح خان زمان میکند وی گوید [1]

خان زمان صاحب امن و امان
پیشرو مہدی آخر زمان
آنکہ خرد یافتہ منشور ازو
چشمۂ خورشید سخن نور ازو
نی بسخن از ہمہ کس بیشتر
در ہمہ فن از ہمہ کس بیشتر
داد گر عیش تو جاوید باد
ظلّ تو ہمسایۂ خورشید باد
بخت کہ القاب تو پر زر نوشت
تیغ ترا سد سکندر نوشت

مثنوی نقش بدیع سے ماخوذ مندرجہ بالا اشعار کی مدد سے اس بیکراں محبت اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو غزالی مشہدی کو اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خان کی ذات سے تھی۔ اس ذاتی دلچسپی اور وابستگی کے پیچھے غزالی کے ذہن و دل میں جو جذبہ پوشیدہ ہے وہ مذکورہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ممدوح کو نمایاں اور منفرد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے اور اس کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت سے قریب اور کذب و ریا سے بہت دور ہے۔ اس نے اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے اس کی زندگی کے حقیقی پہلوؤں کو زیر نظر رکھا ہے اور

[1] خزانۂ عامرہ - آزاد بلگرامی - نیگور لائبریری لکھنؤ صفحہ ۳۶۳

اسد ہر اصول کو ہر جگہ حتی الامکان برتنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے۔
اس وجہ سے اس امر کو بھی یقینی تصور کیا جا سکتا ہے کہ علی قلی خاں کی سرپرستی
اور نوازش سے وہ اتنا مطمئن تھا کہ اس کے کلام میں جذبہ کی صداقت
جا بجا جھلکتی ہے۔

تذکروں اور تاریخی کتب میں اس واقعہ کے حالات بھی بہت مختصر
اور مبہم ہیں۔ لیکن بہر حال تذکرہ نویسوں کے بیانات سے اس بات کی
تصدیق ہوتی ہے کہ غزالی ابتداً خان زماں کے دربار سے وابستہ رہا اور
اس کے ممدوح اور سرپرست خاندان کی فیاضیوں کا سلسلہ عرصے
تک دراز رہا۔ غزالی ان سرپرستوں سے فیضیاب ہوتا رہا پھر خان زماں کے قتل کے
بعد وہ اکبر کے دربار سے وابستہ ہو گیا، اور آخر عمر تک وہیں رہا۔

آئین اکبر مصنفہ ابوالفضل کے زیر نظر نسخہ میں جو کہ نہایت مستند
اور قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے، فاضل مرتب سرسید احمد نے غزالی کے حالات
کے باب میں زیر حاشیہ جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے مذکورہ بالا امر کی تصدیق
ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں [1]

"بالجملہ مولانا بجونپور آمد، مدتی بخدمت خان زمان ماند بعد ازاں کہ
خان زمان بقتل رسید او بحضور شاہی رسید"

نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں بھی تقریباً یہی بیان دیا ہے
جس سے آئین اکبری میں مرقوم حاشیہ کی تصدیق ہوتی ہے [2]

"ملا غزالی مشہدی چند سال پیش خان زماں بود وچون
خان زماں بقتل رسید در خدمت حضرت الٰہی میگذرانید"

مذکورہ دونوں بیانات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ
غزالی خان زماں کے قتل کے بعد اکبر کے دربار سے منسلک رہا۔ ملا بدایونی

---

[1] آئین اکبری۔ ابوالفضل۔ ندوہ لائبریری۔ لکھنؤ۔ صفحہ ۱۶۱ [2] طبقات اکبری۔ نظام الدین احمد

نے اس نتیجہ پر اپنی مہر ثبت کر کے اس بات کو اور بھی پختہ قرار دیا ہے ملّا بدایونی منتخب التواریخ میں غزالی کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں :۔

"چند سال پیش خان زمان بود بعد ازان بملازمت پادشاہی رسیدہ"
اس سلسلے کی سب سے واضح ، جامع اور مختصر تحریر ملّا بداؤنی کی ہے جس کے ذریعہ سے اولاً ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ غزالی اکبر کے دربار میں پہونچنے کے بعد خطاب ملک الشعرائ سے نوازا گیا۔ صاحب منتخب التواریخ کے الفاظ درج ذیل ہیں [1]

"چند سال پیش خان زماں بود بعد ازان بملازمت پادشاہی رسیدہ خطاب ملک الشعرا" یافت"

مندرجہ بالا سطروں میں جو بحث کی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ غزالی اکبر کے دربار میں خطاب ملک الشعرا سے نوازا گیا۔ لیکن اہم تذکروں اور تاریخی کتب کی ورق گردانی سے یہ دلچسپ اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ غزالی نہ صرف دربار اکبر کا بلکہ ہندوستان کا پہلا ملک الشعرا مقرر ہوا تھا اور عہد حکومت تیموریہ میں ہندوستان کی سرزمین پر سب سے پہلے ملک الشعرائ کے خطاب سے بہرہ مند ہونے والی شخصیت غزالی مشہدی ہی کی ہے۔ ابوطالب محمّد بن اصفہانی نے تذکرہ " خلاصۃ الافکار" میں ملّا غزالی مشہدی کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس کے نام سے ہندوستان میں سب سے پہلے خطاب "ملک الشعرا" موسوم کیا گیا۔ ابوطالب کے الفاظ درج ذیل ہیں :۔ [2]

" او اوّل کسی است کہ در ملک ہند بملک الشعرائی موسوم گردید "

مثنوی نگاروں کے تذکرہ ہفت آسمان میں اس کے مصنف احمد علی نے بھی یہی کہا ہے کہ غزالی خان زماں علی قلی خاں کے قتل کے بعد

---

[1] منتخب التواریخ۔ ملا بداؤنی۔ ٹیگور لائبریری۔ لکھنؤ۔ صفحہ ۱ [2] خلاصۃ الافکار۔

دربار اکبری سے منسلک ہوگیا - وہاں شاہانہ عنایت اور خطاب "ملک الشعراء" سے بھی نوازا گیا - صاحب تذکرہ ہفت آسمان نے "مفتاح التواریخ" کے حوالے سے آگے مزید لکھا ہے کہ وہ تیموری عہد کا پہلا شاعر ہے جو مذکورہ خطاب سے سرفراز ہوا اور اس کے بعد فیضی، طالب آملی، اور کلیم وغیرہ بھی اسی خطاب سے نوازے گئے - احمد علی کی تحریر مندرجہ ذیل ہے [1]

"در مفتاح التواریخ نوشتہ است کہ در عہد دولت تیموریہ اول اوست کہ بایں خطاب.

نامور شدہ پس از وی فیضی و طالب آملی و قدسی و کلیم ہر یکی ایں خطاب یافتہ انتھی -

خلاصۃ الافکار اور مفتاح التواریخ کے حوالے سے ہفت آسمان کے مذکورہ بالا اقتباسات کی موجودگی میں یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہونچا کہ غزالی مشہدی نہ صرف دربار اکبر کا پہلا ملک الشعراء ہے بلکہ عہد سلطنت تیموریہ میں سرزمین ہندوستان پر سب سے پہلے اسی کو اس اعلیٰ اور منفرد خطاب کی دولت سے مالامال کیا گیا - اس طرح غزالی کا مرتبہ فارسی ادبیات کی تاریخ میں کچھ اور بڑھ جاتا ہے اور اس امتیاز خاص کی بنا پر وہ اپنے ہم عصر اور مابعد کے قابل ذکر اور مشہور شعراء سے کافی حد تک ممتاز اور نمایاں قرار دیا جا سکتا ہے -

غزالی کی آخری عمر کا وہ حصہ جو مغل دربار میں گذرا اس کی زندگی کا زرّیں دور بھی قرار دیا جا سکتا ہے - اس لئے کہ اسی دور میں اسے ملک الشعراء جیسے اہم اور نمایاں خطاب سے نوازا گیا - جس سے اس کی عمر کی ساری برگشتگی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا - اور وہ تخلیق ادب میں دل و جان سے محو ہوگیا - اس کے علاوہ دربار اکبری اور دوسرے امراء کے درباروں

---

[1] ہفت آسمان - احمد علی - ٹیگور لائبریری - لکھنؤ - صفحہ ۱۰۰

سے بھی اس کی خوب قدر و منزلت ہوئی اور اس کی خدمات کا اتنا اعتراف ہوا جو کسی بھی فنکار کے لئے "نعمت غیر مترقبہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں غزالی نے ہمہ تن متوجہ ہو کر اپنے ادبی سرمایہ میں لاتعداد اضافے کئے اور بحث و مباحثہ میں شریک ہو کر اپنی تیزی اور چستی کی بنا پر اپنے ہم عصروں سے سبقت حاصل کی۔ دربار اکبری کے ایک امیر قلیچ خان المتخلص بہ الفتی سے غزالی کی ادبی رسہ کشی ہوئی اور ہجویات کے جو باہمی تبادلے ہوئے ان میں غزالی نے اپنے حریف کو شکست دے کر اکبر کی نگاہوں میں اپنا مقام بنا لیا۔ اکبر نے ان مباحث میں غزالی کی حاضر دماغی اور بلا کی ذہانت کا اعتراف کیا۔ دراصل اکبر کے دربار میں اس قسم کے ادبی مباحث اور معرکے برابر ہوتے رہتے تھے اور ایسے مباحث میں حصہ لینے کے لئے درباری دانشوروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ زمانے کے کیف و کم اور ہم عصروں سے رسہ کشی کے مذکورہ ماحول میں غزالی کی ادبی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ مختلف مباحث میں حصہ لے کر اس نے اپنی عظمت اور اولیت کا ثبوت دیا اور متعلقہ درباریوں میں ہمیشہ دوسروں سے ممتاز اور منفرد رہا اس نے اپنی ساری عمر شعر و ادب کی خدمت میں صرف کر دی اور بالآخر ماحول کی طرف سے ملے ہوئے احساس تنہائی سے عاجز آ کر فرشتۂ اجل کی چوکھٹ پر اپنی جبیں خم کر دی۔ خود کہتا ہے [1]

جان دادم و فارغ شدم از محنت ہجران
یعنی کہ ز شبہائی دگر بہترم امشب

مندرجہ شعر کے مفہوم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ساری عمر ادبی خدمات اور ان کے اعترافات سے وہ اس اس قدر مطمئن اور مسرور رہے کہ بخوشی جان دے دینے پر آمادہ ہے اسی مضمون کے ایک اور شعر میں بھی

غزالی نے اپنی خوشحال زندگی اور اطمینان بخش موت کی طرف اشارہ کیا ہے [1]

چراغ عمر نشاندم بیک نفس دم مرگ
کہ بہتر است نشاندن بوقت خواب چراغ

ہندوستان اور ایران کے آسمان ادب پر سینتالیس برس جھلملانے والا درخشندہ چراغ بجھ گیا۔ دنیا کی آنکھیں اس کی شخصیت کی رنگینی اور ذہانت و ذکاوت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئیں۔ لیکن اس کے کلام کی درخشندگی آج تک دنیائے شعر و ادب کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہے۔ ہمیں آئندہ سطروں میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لینا ہے کہ فارسی ادب کے اس لعل گراں مایہ کی موت کب کہاں اور کیسے واقع ہوئی۔ تذکرہ نویسوں کی ایک بڑی تعداد اس امر پر متفق ہے کہ غزالی کی موت جمعرات ۲۷ رجب (۹۸۰ھ کو احمد آباد گجرات میں ہوئی اور بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے اس کی تدفین موضع سرخیج کے اس قبرستان میں ہوئی جہاں شاہی خاندان کے لوگ اور مشائخ و کبار کی تدفین عمل میں آتی تھی۔ متعدد تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ بھی معرض علم میں آیا ہے کہ غزالی کی موت پر فیضی، قاسم کاہی اور میر اسیر نے قطعات تاریخ لکھے تھے جو آئندہ سطروں میں زیر بحث آئیں گے۔ لیکن کچھ تذکرہ نگاروں کے اختلافی بیانات کی وجہ سے معمولی سا تذبذب پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس سلسلے میں بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو ان کے اختلافی بیانات کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی مذکورہ بالا امر کی تائید اور تردید میں جن تذکرہ نگاروں نے بیانات دئے ہیں انھیں حقیقت سے ہم کنار کرنے کے لئے سب سے پہلے زیر نظر تمام تذکروں کی درجہ بندی لازمی ہے جس سے اصل بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ صاحب منتخب التواریخ نے غزالی کی وفات اور اس کی تدفین کے بارے میں

---

[1] کلیات غزالی (دست نوشت) موزۂ برطانیہ (لندن) ردیف (غ)

مندرجہ بیان دیا ہے - قاسم کاہی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ بھی منتخب کی تحریر میں شامل ہے سلہ

"وفاتش در شب جمعہ بیست و ہفتم ماہ رجب در سنہ نہصد و ہشتاد (۹۸۰) فجاءۃً و بغتۃً در احمدآباد واقع شد و بندگان بادشاہی حکم فرمودند

تا او را در سرکنج کہ مقبرۂ مشائخ کبار و سلاطین سالفہ است دفن کردند و قاسم ارسلان از زبان قاسم کاہی ایں تاریخ گفت -

قطعہ

برد گنجی غزالی از معنی
مدفنش خاک پاک سرکنج است
بعد یک سال سال تاریخش
احمدآباد و خاک سرکنج است

تعجب خیز بات یہ ہے کہ ملّا بداؤنی جیسے معتبر اور با وثوق ذریعہ سے ملنے والی معلومات میں آخر اس قدر فرق کیوں ہے؟ منتخب التواریخ میں مندرجہ بالا تحریر سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی وفات ۲۷ رجب ۹۸۰ھ میں واقع ہوئی تھی لیکن قاسم کاہی کے جس قطعۂ تاریخ کو صاحب منتخب نے نقل کیا ہے، وہ ان کے پہلے بیان کی تردید کرتا ہے قطعۂ تاریخ کا چوتھا مصرع اس طرح سے ہے -

احمد آباد و خاک سرکنج است

اگر پورے مصرعے کے اعداد نکالے جائیں تو مادۂ تاریخ ۱۴۸۲ھ برآمد ہوتا ہے لیکن اگر اس مصرع کے آخر سے لفظ "است" کم کردیا جائے جس کے اعداد ۴۶۱ ہوتے ہیں تب بھی مادۂ تاریخ دس سو اکیس

سلہ منتخب التواریخ - ملا بداؤنی - ٹیگور لائبریری - لکھنؤ صفحہ ۱۷۱

(۱۰۲۱) رہ جاتا ہے۔ چونکہ قطعۂ تاریخ کے تیسرے مصرع میں صنعت تخرجہ کا استعمال کرکے ایک عدد کم کر دینے کی ہدایت موجود ہے۔ مصرع ملاحظہ ہو۔

بعد یک سال، سال تاریخش

اس لئے دس سو اکیس میں ایک عدد کم کر دینے کے باوجود بھی مادۂ تاریخ دس سو بیس (۱۰۲۰) بچتا ہے جو دراصل غزالی کی موت کے چالیس سال بعد کی تاریخ ہے۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ منتخب التواریخ (۱۰۰۴ھ) میں پایۂ تکمیل کو پہونچی تھی اور اسی سال اس کے مصنف ملاّ عبدالقادر بدایونی کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔ اس طرح غزالی کی موت ۱۰۲۰ھ میں یعنی خود صاحب منتخب التواریخ کی موت کے سولہ سال بعد کیسے واقع ہو سکتی ہے۔

لہٰذا اس سلسلے میں کافی غور خوض کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملاّ بدایونی نے غزالی کی وفات پر کاہی کا جو قطعہ تاریخ درج کیا ہے اس کے چوتھے مصرعے میں "احمد آباد خاک سر کیج" کے بجائے "احمد آباد و خاک سر کیج" تحریر ہوگا۔ جو کتاب کی سہو یا منتخب التواریخ کے زیر نظر نسخہ کے مرتب کی غلطی سے "سر کیج" کے بجائے "سر کیج" درج ہو گیا۔ اگر اس عذر کو تسلیم کرکے "احمد آباد و خاک سر کیج" کو صحیح مان لیا جائے تو مندرجہ بالا قطعہ تاریخ کا مادۂ درست ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مندرجہ مصرعہ سے غزالی کا سال وفات نو سو اکیاسی (۹۸۱) نکلتا ہے اور چونکہ ایک عدد کا تخرجہ ہے اس لئے مادۂ تاریخ نو سو اسی (۹۸۰ھ) قرار پاتا ہے۔ مندرجہ دلیل کی تصدیق کے لئے تذکرۂ نفائس المآثر کے اقتباس پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ جس کی مدد سے غزالی کا سن وفات نو سو اسی (۹۸۰) قرار دیا جا سکتا ہے۔

صاحب تذکرہ نفائس المآثر نے کاہی کے قطعہ تاریخ کو اسطرح پیش کیا ہے[1]

بود گنجی غزالی از معنی، مدفنش خاک پاک سرکیج است
بعد یک سال سال تاریخش، احمد آباد و خاک سرکیج است

صاحب نفائس نے اپنے قطعہ میں "سرکنج" کے بجائے "سرکیج" کا قافیہ مقرر کیا ہے۔ اس لئے "احمد آباد و خاک سرکیج" کے اعداد کو جوڑ کر سال وفات نوسو اکیاسی (۹۸۱) ہوتا ہے۔ جس میں سے ایک عدد کا تخرجہ کر دیا جائے تو وفات کا سن نوسو اسّی (۹۸۰) قرار پاتا ہے۔ نفائس المآثر کے مندرجہ بالا اقتباس کی مدد سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے کہ منتخب التواریخ میں درج غلط مادۂ تاریخ تذکرہ نگار کی غلطی نہیں بلکہ کتابت کا سہو ہے جس کے لئے صاحب منتخب کو قطعی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منتخب اور نفائس کے اقتباسات کی تشریح و تصحیح ہو جانے کے بعد اس قیاس کو مزید تقویت پہونچتی ہے کہ غزالی کا سن وفات نوسو اسّی (۹۸۰) ہی ہے اور اس میں کسی مبالغہ یا شک و شبہہ کی قطعی طور پر کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

نفائس المآثر کی موجودگی سے ایک اور اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں غزالی کی موت سے متاثر ہو کر اس کے ایک اہم ہم عصر شاعر میر اسیری نے جو قطعۂ تاریخ وفات لکھا ہے وہ بھی درج ہے۔ میر اسیری کے قطعہ تاریخ سے بھی مادۂ تاریخ نوسو اسّی (۹۸۰) ہی نکلتا ہے جس سے تذکرۂ مذکورہ کے گزشتہ بیان کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی ہے۔ اسیری کا قطعہ منقولہ نفائس المآثر درج ذیل ہے[2]

غزالی رفت چوں بیرون ز عالم — ز چشم اہل معنی جوئی خون رفت
نشان جستم ز تاریخش خرد گفت — ز کان فضل یک گوہر بدون رفت

---

[1] نفائس المآثر - علاء الدولہ کامی - ٹیگور لائبریری - لکھنؤ صفحہ ۵۳۷
[2] نفائس المآثر -

"کان فضل" کے اعداد نوسو اکیاسی (۹۸۱) ہوتے ہیں اور اگر شاعر کی ہدایت کے مطابق صنعت تخرجہ کا استعمال کر کے اس میں سے ایک عدد گھٹا دیا جائے تو صرف نوسو اسّی (۹۸۰) بچتا ہے اور اس طرح گزشتہ سطروں میں پیش کئے جانے والے دلائل کی صحت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ منتخب تذکرہ نگاروں کے اختلافی جائزہ لینے کے بعد یہ امر تقریباً طے شدہ ہے کہ یہ غلطی دراصل تذکرہ نگاروں کے اختلافات پر نہیں بلکہ کاتب کے سہو پر مبنی ہے جس کی وجہ سے اس سلسلے میں تذبذب پیدا ہوا۔ لیکن متعدد تحریری شہادتوں کی موجودگی میں سب سے زیادہ قرین قیاس اور معتبر بیان یہی معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی وفات نوسو اسّی (۹۸۰) میں واقع ہوئی۔
صاحب تذکرہ ہفت اقلیم نے وفات غزالی کے سلسلے میں مختصراً تحریر کیا ہے [1]

"بعد از چند وقت بمرگ فجئی از عالم درگذشته در سرکج گجرات مدفون گردند"

واضح ہو کہ ہفت اقلیم کی نثری تحریر میں لفظ "سرکج" یا "سرکیج" کے بجائے صرف "سرکج" ہی مندرج ہے اور اس میں قاسم کاہی کے اسی قطعہ کو نقل کیا گیا ہے جس کا تفصیلی ذکر منتخب التواریخ اور نفائس المآثر کے اقتباسات میں آچکا ہے۔ لیکن اس قطعہ کا چوتھا مصرعہ گزشتہ سطروں میں مندرج قطعۂ تاریخ کے چوتھے مصرعے سے کچھ مختلف ہے۔ ہفت اقلیم میں درج ہے کہ "احمد آباد دخاک سرکج است" جبکہ "احمد آباد و خاک سرکج است" کے اعداد صرف نوسو اکہتّر (۹۷۱) ہوتے ہیں، اگر اس میں قطعہ کے تیسرے مصرعہ میں دی گئی ہدایت۔

"بعد یکسال، سال تاریخش"

[1] ہفت اقلیم - امین احمد رازی - ٹیگور لائبریری - لکھنؤ صفحہ ۴۱۸

غزالی مشہدی

کے مطابق ایک عدد کم کر دیا جائے تو مادۂ صرف نوسوستّر (۹۷۰) ہی رہ جائے گا جو غزالی کی عمر سے دس سال کم ہے اور خصوصاً نوسوستر کا زمانہ غزالی کی آخری عمر کا وہ زرّین دور ہے جس میں شاعر مذکور کی عزت، شہرت، ثروت، اور عظمت میں بیش بہا اضافے ہوئے اور اسی دور میں اس نے اپنے بہت سے دوسرے ہم عصروں پر سبقت اور اوّلیت حاصل کی۔ اس لئے نوسوستّر (۹۷۰) میں اس کی موت کے سلسلے کی تحریر قطعی حق بجانب نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ اقتباس بھی کتابت کے سہو سے اپنی اصلی شکل کھو بیٹھا ہو اور کاتب کی غلطی سے لفظ "مرنجیح" کے بجائے "سرنج" درج ہو گیا ہو جس کے سبب مادۂ تاریخ غزالی کی وفات کے سن سے دس سال قبل برآمد ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اغلب یہی ہے کہ ہفت اقلیم کے اصل مسودہ میں صحیح تاریخ وفات درج ہوگی۔ لیکن اصل مسودے کی نقل ہوتے ہوتے زیر نظر نسخہ مخطوطۂ ٹیگور لائبریری تک جو طویل وقفہ گزر گیا ہے اس میں یہ چھوٹی چھوٹی تحریری تبدیلیاں ممکن ہیں، انھیں تذکرہ نگاروں کی نہیں بلکہ کاتب کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

اب تک غزالی کے سن وفات کی نشان دہی کرنے والے جن تذکروں کا جائزہ لیا جا چکا ہے اس میں قاسم کاہی کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفات شامل تھا اور یہ قطعہ مختلف تذکروں میں الگ الگ ڈھنگ سے درج تھا لیکن سارے تذکرہ نویسوں کے بیانات کا جائزہ لینے کے بعد اور میر اسیری کے قطعۂ تاریخ مشمولہ نفائس المآثر کو نظر میں رکھتے ہوئے یہی نتیجہ نکالا گیا کہ غزالی کا سن وفات نوسو اسّی (۹۸۰) ہی ہے۔ اس فیصلے کی تصدیق کے لئے ذیل میں چند تذکروں کے نثری اقتباس اور

فیضی کا لکھا ہوا وہ قطعۂ تاریخ وفات منقول کیا جارہا ہے جس میں اس نے غزالی کی وفات کا سن نو سو اسی (۹۸۰) قرار دیا ہے غزالی کے دور سے قربت رکھنے والے اہم ترین تذکروں میں عرفات العاشقین بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور معتبر ذرائع میں شمار کیا جاتا ہے۔ غزالی کی وفات کے سلسلے میں صاحب عرفات کی تحریر درج ذیل ہے۔

"شیخ فیضی نسبت اعتقاد و ارادت بخدمت وی بسیار داشته و تاریخ فوتش گفته است"

قدوۂ نظم غزالی که سخن	همه از طبع خداداد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بدو طور	سنۂ نهصد و هشتاد نوشت

(۹۸۰ ہجری)

مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی عقیدت اور ارادت کے پیش نظر فیضی نے غزالی کی وفات سے متاثر ہو کر جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے اس کے آخری مصرعہ "سنۂ نهصد و هشتاد" کے ذریعہ غزالی کے سن وفات نو سو اسی (۹۸۰) ہجری پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور مذکورہ سن کو حرف آخر قرار دیا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا معتبر تاریخی شواہد کے باوجود تذکرہ "ریاض العارفین" اور "آتشکدہ" میں درج ہے کہ غزالی کی وفات آگرے میں ہوئی۔ لیکن گزشتہ صفحات میں متعدد معتبر و باوثوق ذرائع سے یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ غزالی کی موت اس وقت واقع ہوئی تھی جب وہ شاہی قافلے کے ساتھ گجرات جارہا تھا۔ اور اس کی موت کے بعد شہنشاہ اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ اسے سرکھیج کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جائے جہاں عام طور پر شاہی خاندان کے لوگ سپرد خاک کئے

لہ عرفات العاشقین۔ تقی اوحدی۔ خدابخش لائبریری۔ پٹنہ صفحہ ۵۲۰ (ج ۲)

جاتے تھے جب غزالی کی موت احمد آباد گجرات کے سفر کے دوران ہوئی تو پھر اس کی جائے وفات آگرہ میں بیان کرنا غلط نگاری نہ سہی سہو قلم تو ہے ہی ۔

نوٹ :

مذکورہ بالا مضمون " ہندوستان کا اوّلین ملک الشعراء ۔ غزالی مشہدی " در اصل میرے زیر تکمیل تحقیقی مقالہ " فارسی ادب کے ملک الشعراء " کے سلسلے مضامین کی ایک کڑی ہے ۔ یہ مضمون ہندوستان کے پہلے ملک الشعراء کے حالات زندگی، سیرت اور کلام کے ایک جائزے پر مشتمل ہے ۔ اس کے بعد اس سلسلے کا دوسرا مضمون ایران کا اوّلین ملک الشعراء سپرد قلم کیا جا رہا ہے، جو بہت جلد پیش خدمت کیا جائے گا ۔ یہ سلسلہ ایران و ہند میں مختلف ادوار میں " ملک الشعراء " کا خطاب پانے والے شعراء کے حالات اور ادبی کارناموں کے تفصیلی ذکر کے لئے مخصوص ہے جن کی فہرست نصف صد کے قریب ہے ۔ اس سلسلے کے دوسرے مضامین یکے بعد دیگرے علیحدہ علیحدہ اور پھر مجموعی شکل میں پیش کئے جانے کا ارادہ ہے ۔

(مصنف)

مصنّف کی دیگر تصانیف

۱۔ یادگار آزادی	(انتخاب منظومات)	سنہ ۱۹۶۹ء
۲۔ شش جہت	(انتخاب کلام)	سنہ ۱۹۷۱ء
۳۔ یادوں کے گلاب	(قومی و ملی نظمیں)	سنہ ۱۹۷۳ء
۴۔ بدیسی کہانیاں	(غیر ملکی زبانوں کے تراجم)	سنہ ۱۹۷۶ء
۵۔ لمحوں کا سفر	(سفرنامۂ ایران)	سنہ ۱۹۷۷ء
۶۔ غزالی مشہدی حیات اور کارنامے	(مقالہ برائے ڈاکٹوریٹ آف فلاسفی)	سنہ ۱۹۷۸ء
۷۔ دس بجے رات کے بعد	(مصوّر طویل نظم)	سنہ ۱۹۷۹ء
۸۔ دس بجے رات کے بعد	(غنائیہ ڈرامہ)	سنہ ۱۹۸۱ء
۹۔ ٹوٹتے لمحے	(فلم اسکرین پلے)	سنہ ۱۹۸۳ء
۱۰۔ نوشتے	(شعری مجموعہ) پہلا ایڈیشن دوسرا ایڈیشن	سنہ ۱۹۸۶ء سنہ ۱۹۸۹ء
۱۱۔ کینوس کے رنگ	(مجموعۂ مضامین)	سنہ ۱۹۸۹ء
۱۲۔ مرزا محمد عسکری حیات اور کارنامے	(تحقیقی مقالہ)	(زیر طبع)
۱۳۔ نقشہائے رنگ رنگ	(تبصرے، تقاریظ وغیرہ)	(زیر طبع)

چراغ عمر نشاندم بیک نفس دم مرگ
کہ بہتر است نشاندن بوقت خواب چراغ

سولہویں صدی عیسوی میں ایرانی حکمرانوں نے شعر و ادب پر سخت قسم کی پابندیاں عاید کر رکھی تھیں۔ بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کی شان میں قصائد کہنے والے شعراء صلہ و ستائش کے بجائے سزا و لعنت کے مستوجب قرار دئے جاتے تھے۔ صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد کہنے کی اجازت تھی، اس کے علاوہ فارسی شاعری کی وہ اعلیٰ قدریں جو خامۂ ادب کی میراث رکھتی ہیں، سرزمین ایران پر سسک سسک کر دم توڑ رہی تھیں۔ شعراء کی سرپرستی تو درکنار ان کی دل شکنی اور غم آزاری میں کوئی کسر باقی نہ رکھی جاتی تھی۔

صفوی حکومت کے بانی شاہ اسماعیل اول (۱۵۰۰ — ۱۵۲۴) اور شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ — ۱۵۷۶) سے لے کر اس کے پیشروؤں کے دور تک ایرانی مستقل امتحانی دور سے گزر رہا تھا۔ مذکورہ بالا حکمراں ملک کے سیاسی استحکام کے لئے اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فوجی قوت بڑھانے میں ہمہ طور پر مصروف رہے اس لئے شعر و ادب کی طرف ان کی توجہ قطعی نہیں گئی۔ شاہ طہماسپ نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں شعراء کی سرپرستی و قدردانی کی لیکن جلد ہی وہ مذہب اور علماء مذہب سے اس قدر متاثر ہوا کہ مذہبی شاعری کے علاوہ ہر قسم کی شاعری سے بدظن ہو گیا اور شعراء پر طرح طرح کی بندشیں لگا دیں۔ غرضکہ فارسی شاعری اپنے وطن میں بے وطن ہو گئی اور دربار

کی ٹھوکریں کھانے لگی۔

اس کے برعکس اس دور میں ہندوستان فارسی شاعری کا منبع اور مرکز بنا ہوا تھا۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں ادبا، شعراء، علماء، حفاظ اور دانشوروں کے لئے خزانوں کے منہ کھلے تھے اور داد و دہش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بات بات پر انھیں انعام و اکرام اور صلہ و جاہ و مناصب سے نوازا جاتا تھا۔ اکبر گو کہ بذات خود زیور تعلیم یافتہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے دانشوروں پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا۔ وہ خود بڑا فہیم سخن اور سخن گو تھا۔ شعر و ادب سے ایک خاص قسم کا شغف تھا اور وہ شاعروں سے والہانہ حد تک محبت کرتا تھا۔ قابل ذکر شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد دربار اکبر کی زینت تھی جس میں ایرانیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔ اکبر کے علاوہ دکن و شمالی ہند کے بیشتر امراء کے خود اپنے اپنے دربار تھے۔ اکبر کے چند نامور درباری بھی صاحب دربار ہوئے ہیں ـــــ عبدالرحیم خانخاناں، ملک الشعراء فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی وغیرہ کے درباروں نے فارسی شاعری کے جواہرات کی قدرشناسی کا ثبوت دیا ہے اور ان کی آب و تاب میں مزید اضافہ کیا ہے۔ دکن میں علی عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار کی روایات تاریخ ادبیات کا ایک روشن باب ہیں۔ علی قلی خاں صوبیدار جونپور بھی اپنے فیاضی کے لئے مشہور ہے جس نے غزالی مشہدی کو ایک طویل مثنوی "نقش بدیع" کی تخلیق کے صلہ میں ہر شعر پر ایک طلائی سکہ بطور انعام دیا تھا۔ غرضکہ دکن سے لے کر ہندوستان کے طول و عرض میں شاعروں اور ادیبوں کا دور دورہ تھا اور ہر طرف شعر و ادب کا بازار گرم تھا۔

بظاہر یہی دو بڑے سبب ہیں جن کی وجہ سے بہت سے نامور ایرانی شعراء اور صاحب علم ترک وطن کرکے ہندوستان آ گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے بقول

ایران سے مراجعت کر کے ہندوستان آنے والے فارسی زبان دانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی ۔ صرف اکبر کے دربار میں ایک سو ستر (۱۷۰) نامور ایرانی فنکار موجود تھے جو اپنی دانش و بینش سے ہندوستانی فارسی ادب کے بیش بہا خزانے میں مزید اضافے کر رہے تھے ۔

ایرانی حکمرانوں کی بیجا زور دستیوں سے تنگ آنے کی وجہ سے اور ہندوستانی درباروں کی داد و دہش سے متاثر ہو کر ایران کو خیرباد کہہ کر سرزمین ہند کو وطن ثانی کے طور پر اپنانے والے ان روشن ضمیروں کی طویل فہرست میں غزالی مشہدی کا نام بھی شامل ہے ۔

سید علی رضا نام ۔ غزالی تخلص ۔ مشہدی کیفیت (جیسے قدیم زمانہ میں طوس بھی کہا جاتا تھا) مشہد کی مناسبت ہی سے وہ غزالی مشہدی کے نام سے مشہور ہے ۔ غزالی کو مشہد کی خاک سے والہانہ عشق ہے ۔ وہ خود کہتا ہے کہ ؎

در کارگاہ چرخ اگر نیک و گر بدم
ایں دولتم بس است کہ از خاک مشہدم

اس کا تخلص غزالی کبھی لاشعوری یا غیر فکری طور پر وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس نے نہایت غور و فکر کے بعد یہ تخلص اختیار کیا تھا ۔ اس نے خود وجہ تخلص بھی بیان کی ہے ؎

غزالی شد غزل گوی شمارم
بوصف طلعت یوسف جمالاں
چو آہو بودہ ام از خورد سالے
سگ آہوی چشم خورد سالاں
غزالی بہر آں کردم تخلص
کہ دیدم مردمیہا از غزالاں

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے
شائع ہوئی۔

غزالی کے سن ولادت یا تاریخ پیدائش کے بارے میں تمام ذرائع خاموش ہیں۔ لیکن اس نے اپنے دیوان "آثار الشباب" کے دیباچہ میں خود لکھا ہے کہ مذکورہ دیوان سن نوسو چھیاسٹھ ہجری (۹۶۶ھ) ۔ بعمر تیس سال میں تکمیل کو پہونچا۔ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزالی ۹۳۶ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی عمر کے حالات کے بارے میں بھی تفصیلات درکار ہیں۔ اس کی ایران کی زندگی کے ضمن میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ اوائل عمری ہی سے شعر کہنے لگا تھا شعر و سخن میں اس کا کوئی استاد نہ تھا نیز اپنی فنی صلاحیتوں کی بدولت وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا اور اسے شاہانہ سرپرستی حاصل تھی، لیکن جب حالات نے رخ بدلا تو دوسرے ہم عصروں کے ساتھ غزالی پر بھی الحاد اور مذہب سے بیگانگی کی تہمت لگی اور اسے قتل کر دینے کا حکم صادر ہو گیا۔

غزالی کسی طرح اپنی جان بچاکر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ عراق اور فارس ہوتا ہوا سمندری راستے سے عازم ہند ہوا اور سب سے پہلے دکن کو اپنی منزل بنایا۔ دکن کے امراء سے غزالی کو بے انتہا توقعات وابستہ تھیں اس لئے کہ اس کے بہت سے ہمعصر امرائے دکن کے درباروں میں پہلے سے موجود تھے اور غزالی کو توقع تھی کہ دکن میں اس کی بھی قدر و منزلت ہوگی۔ لیکن نہ جانے کیوں ایسا ممکن نہ ہو سکا اور غزالی کو دکن میں حسب دلخواہ ماحول نہ ملا جس کی وجہ سے اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ابھی وہ اپنی شومئی قسمت پر نوحہ خوانی کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ گورنر جونپور علی قلی خاں کی نگاہ انتخاب اس پر پڑی۔ علی قلی خاں نے ایک ہزار روپیہ نقد، چند گھوڑے اور مندرجہ ذیل قطعہ لکھ کر غزالی کو جونپور آنے کی دعوت دی ؂

ای غزالی بحق شاہ نجف
کہ سوی بندگان بیچوں آئی

چونکہ بیقدر گشتہ آنجا
سرخود گیرو زود بیرولت آی

"سرخود" ـــــ غزالی سریعنی "غین" برابر ایک ہزار اعداد، کہنا یہ ہے کہ ایک ہزار روپیہ کی طرف۔

غزالی نے یہ دعوت قبول کرلی اور جونپور آکر مدتوں علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں کے درباروں سے وابستہ رہا۔ یہیں اس نے اپنی مشہور مثنوی "نقش بدیع" لکھی۔ کلیات غزالی محفوظ موزۂ برطانیہ لندن میں اس کے دو قصائد خان زماں علی قلی خاں کی مدح میں موجود ہیں۔ دربار اکبر سے متعلق دوسرے امراء منعم خاں، نورنگ خاں، مرزا عزیز کوکلتاش اور عرفان شاہ وغیرہ کی مدح میں بھی غزالی نے اسی دور میں قصائد کہے تھے جو اس کے کلیات میں شامل ہیں۔ خان زماں علی قلی خاں کی سرکوبی کے بعد غزالی معتوب ہونے کے بجائے اکبر کا منظور نظر ہوکر اس کے دربار کی زینت بنا۔ شہنشاہ اکبر کی شان میں کہے ہوئے قصائد پر مشتمل ایک دیوان "گنج اکبری" بھی اس کے کلیات کا ایک اہم جز ہے۔ اکبر کے دربار میں غزالی کم و بیش چودہ برس تک اکبر کے دربار سے وابستہ رہا اور اس عرصہ میں اس کے فنی جواہرات نے ہمعصروں پر فوقیت حاصل کرلی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کی نوازشوں کا متحمل ہوا اور آخرکار اکبر نے اسے اپنے دربار کا پہلا ملک الشعراء مقرر کیا۔ مفتاح التواریخ اور تذکرہ نتائج الافکار میں مرقوم ہے کہ غزالی پہلا شخص ہے جسے عہد تیموریہ میں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا۔ بعد میں ابوالفیض فیضی، طالب آملی، ابوطالب، کلیم ہمدانی اور قدسی وغیرہ اس عظیم المرتبت اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

۲۷ رجب شب جمعہ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) کو شاہی قافلہ کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے احمدآباد، گجرات میں غزالی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور موضع سرکھیج احمدآباد

کے شاہی قبرستان میں، جہاں شاہی خاندان کے لوگ، علماء، فضلاء اور مشائخین وغیرہ دفن کیے جاتے تھے وہیں اس کی تدفین عمل میں آئی۔

جان دادم وفارغ شدم از محنت ہجراں
یعنی کہ ز شبہائی دگر بہترم امشب

غزالی کی موت سے متاثر ہو کر ملک الشعراء فیضی، قاسم کاہی اور میر اسیری وغیرہ نے قطعات تاریخ کہے لیکن فیضی کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ وفات اس سلسلہ میں بہت اہم ہے۔ مذکورہ قطعہ تقی اوحدی کے تذکرہ عرفات عاشقین سے منقول ہے ؎

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن
ہمہ از طبع خداداد نوشت
نامۂ زندگی او ناگاہ
آسماں بر ورق باد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بدو طور
سنۂ نہصد و ہشتاد نوشت

سنہ ۹۸۰ھ

بختاور محمد خاں نے تذکرۂ "مراۃ العالم" میں لکھا ہے کہ غزالی کی وفات کے بعد اس کے یہاں سے تقریباً تیس لاکھ روپیہ نقد اور قیمتی دوسرا سامان واسباب کافی تعداد میں برآمد ہوا۔

اتنی کثیر دولت اور مادی سرمایہ کے علاوہ غزالی کے باقیات میں جو علمی، ادبی اور قلمی سرمایہ موجود ہے اس کی کوئی قدر یا قیمت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اس کے کلیات میں نثری مضامین کے علاوہ قصیدہ، مثنوی،

غزل، ترجیع بند، قصیدہ، رباعی اور سوخت، ہجو اور متفرقات کی شکل میں چالیس ہزار اشعار موجود ہیں۔ غزالی نے یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن قصاید اور غزلیات پر اسے قدرت کاملہ حاصل ہے، مثنویات میں "نقش بدیع" اور "ساقی نامہ" اس کے دو اہم شاہکار ہیں۔ قطعات و رباعیات میں فلسفہ اور تصوف کی چاشنی ملتی ہے۔ غرضکہ اس کا سارا کلام فکر و معانی کا گنج قارون ہے۔

غزالی کے عہد اور مابعد کے تقریباً تمام تذکرہ نویس اور مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ وہ اول درجہ کا شاعر تھا اور فارسی ادبیات کی تاریخ میں وہ ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔

میر تقی میر

جامع کمالات میر محمد تقی میرؔ اکبر آباد (آگرہ) کے ایک شریف خاندان میں میر علی متقی کے یہاں پیدا ہوئے۔ سن ولادت متنازعہ، یعنی ۱۱۳۵ھ یا ۱۱۳۷ھ ہجری ہے۔ آپ بارہ سے پندرہ برس کی عمر میں اول دہلی آئے اور واپس اکبر آباد چلے گئے۔ دوبارہ سولہ سترہ برس کی عمر میں آکر باقاعدہ سکونت اختیار کی۔ تقریباً سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری کی ابتدا ہوئی اور اپنے محسن سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے زیر تربیت پروان چڑھتے رہے۔ دلی کی سیاسی حالت گو کہ روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی لیکن امراء اور رؤسا میں شعر و ادب کے دلدادہ موجود تھے۔ میر تقی میرؔ کی سرپرستی دیگر امرائے سلطنت کے علاوہ نواب بہادر خواجہ سرا نے کی۔ لیکن اب شاہان دہلی کسی فنکار کی بڑے پیمانے پر سرپرستی کر سکیں یہ ناممکن تھا۔ لیکن ولی دکنی اور ان کے دیوان کی دہلی آمد کے بعد شعر و شاعری کا ایسا دور چلا کہ شعراء کی کثرت کی وجہ سے ان کا شمار مشکل ہو گیا۔ اس بھیڑ میں اچھے اور برے کا امتیاز دشوار ہو گیا۔ ایسے سخت اور پر آشوب دور میں اپنی شناخت قائم کرنے میں میر تقی میرؔ نے انفرادیت کا ثبوت دیا ؎

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میرؔ
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

اور پھر بات یہاں تک پہونچی ؎

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اسی زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے انھوں نے باوثوق لہجے میں یہ اعلان کیا ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

ندگی کے تلخ و تند تجربوں نے میر کے کلام میں آگہی اور ان کی شخصیت میں خود
ہی کے عناصر کو جنم دیا ہے

اتنا سمجھے کہ کچھ نہ سمجھے، ہائے
سو بھی اک عمر پہ ہوا معلوم

سادگی اور پرکاری نے عمر بھر میر صاحب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور خود دار طبیعت
نے انھیں زمانے کے حالات اور خود اپنی ذات سے منحرف کر دیا۔ صوفیوں کی شان
دکھنے والا یہ شاعر مذہب عشق سے بیگانہ ہو کر آخر یہ کہنے پر مجبور ہوا۔

میر کے دین و مذہب کا تم پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

لکھنؤ کی سرزمین اپنی روایتی وضعداری اور مہمان نوازی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان اور بیرون ملک کے لوگوں نے اس شہر کے خلوص اور اخلاق کا لوہا مانا ہے۔ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں لکھنؤ کی اسی نمایاں خصوصیت کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں لکھنؤ کو "گہوارۂ تہذیب و تمدن" اور "شہر دوستاں" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اسی شہر کو شاعرانہ اصطلاح میں عرصے سے "شہر نگاراں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کے عاشقوں نے یہ تک کہنے میں باک نہیں محسوس کیا ؎

لکھنؤ ہم پر فدا ہم ہیں فدائے لکھنؤ
کس کی ہستی ہے بھلا ہم سے چھڑائے لکھنؤ

لکھنؤ پر مرمٹنے کا یہی جذبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والے بعض عالمگیر شہرت یافتہ شاعروں اور ادیبوں کو یہاں کھینچ لایا۔ ان حضرات نے نہ صرف زندگی بسر کرنے کے لئے لکھنؤ کا انتخاب کیا بلکہ یہیں پیوند خاک ہو کر "شام غریباں لکھنؤ" کی عظمت میں اضافہ کیا اور اہل لکھنؤ کے ساتھ "خاک نشین" ہونے کا شرف بھی حاصل کیا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

میر تقی میرؔ

مثلاً خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے اولین شعراء میں ولی دکنی اور سراج

اورنگ آبادی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ـــــ دراصل شمالی ہند میں اردو شاعری کے خدوخال نمایاں کرنے میں میرؔ نے اہم اور قابل قدر رول ادا کیا ہے۔ آپ دلی کی تباہی سے متاثر ہو کر آصف الدولہ بہادر کے دربار اودھ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ وہاں گزارا۔ خودداری اور تنک مزاجی نے "دربار داری" کی اجازت نہ دی۔ آخر شمس میاں تحسین علی خاں کی مسجد (چوک) میں گوشہ نشین ہو گئے۔ بادشاہ اودھ نے ہر چند انھیں منانا چاہا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے ایک مرتبہ بادشاہ کی سواری چوک سے گزر رہی تھی اور میرؔ صاحب سامنے سے آرہے تھے۔ بادشاہ نے گفتگو کا ارادہ کیا تو انھوں نے بے ساختہ جواب دیا۔

"شرفاء سرِ راہ گفتگو نہیں کیا کرتے۔"

شعر ہیں گو مرے خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

عوامی شاعری کا دعویٰ کرنے والا اردو کا یہ خوددار شاعر اہل لکھنؤ سے اپنا تعارف بڑے فخریہ انداز میں خود کراتا ہے ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ایک بار جب آصف الدولہ بہادر میرؔ صاحب کی علالت کی خبر پاکر تحسین کی مسجد کے حجرے میں عیادت کو پہونچے اور حسب دستور مصافحہ کرتے وقت ان کے ہاتھ لعل و جواہر سے بھر دیئے تو میرؔ نے برجستہ یہ مطلع پڑھا ؎

دیوانہ پن ہمارا آخر کو رنگ لایا ملنے کو جو بھی آیا ہاتھوں میں سنگ لایا

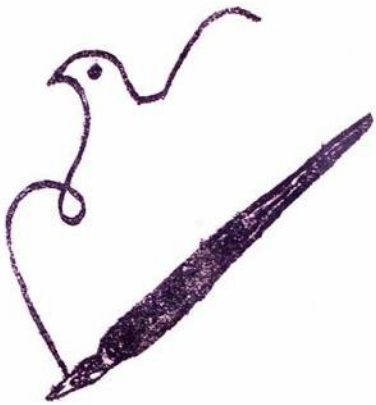

اپنے قلم سے

آدمی جس سرزمین پر جنم لیتا ہے، جہاں آنکھیں کھولتا ہے اور پروان چڑھتا ہے، وہاں کی مٹی سے اسے قدرتی طور پر لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا لگاؤ جس میں عشق، محبت اور کسی چیز پر مرمٹنے کی کیفیتیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ جذبہ یوں تو ہر شخص کے دل میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے لیکن کسی فنکار کے دل میں یہ جذبہ عام انسانوں سے کچھ زیادہ اور گہرا پایا جاتا ہے۔ اپنے سماج، اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنے آس پاس کے بہت سے معمولی معمولی روز مرّہ پیش آنے والے واقعات کو فنکار کا ذہن۔ فکر اور تخیّل کی

یقیناً یہ لکھنؤ کی روایتی وضعداری کا ایک ادنیٰ سا نمونہ تھا کہ بادشاہ وقت میرؔ صاحب کی کھری کھری باتیں سننے کے لئے ان کی خدمت میں بذات خود حاضر ہوا۔ شاید میرؔ صاحب کو لکھنؤ والوں کی یہی ادا بھا گئی جو انھوں نے یہیں کی سرزمین کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کر لیا۔ وہ تو ٹوٹتے ٹوٹتے کہتے ہیں ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جب جسم کی عمارت غموں سے نڈھال ہو گئی تو وہی شاعر جو یہ بلند بانگ دعویٰ کرتا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اب زمانے کے سرد گرم کا شکار ہو کر کہتا ہے ؎

ہو گا کسی دیوار کے سائے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اپنی وفات ۱۸۱۰ء کے بعد میرؔ صاحب "بھیٹی" نام کے محلے کے قبرستان اکھاڑہ بھیم میں دفن کیے گئے۔ زمانے کے جوار بھاٹے نے قدیم لکھنؤ کے اس محلے کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اس کے باوجود لکھنؤ کے سٹی ریلوے اسٹیشن کے عقب میں ریلوے پل کے قریب، ایک مسجد سے متصل کچھ عرصہ قبل تک میرؔ صاحب کے قبر کے آثار موجود تھے۔ اب وہ حصہ جدید قسم کی عمارتوں کی نذر ہو گیا لیکن لکھنؤ کی بلدیہ کی جانب سے اسی جگہ لگا ہوا سڑک کا پتھر زبان بے زبانی سے میرؔ کے اسی جگہ موجود ہونے کا واضح اشارہ کر رہا ہے۔

میرؔ صاحب نے کہا تھا ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

لیکن عجیب اتفاق ہے ان کی یہ تاکید کارگر ثابت نہیں ہوئی ۔ اور ان کے سرہانے سے روز و شب گزرنے والی ریل گاڑیوں کے شور و شغب کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ۔

محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع سودا اردو کے صف اول کے قصیدہ نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کے آباء و اجداد کابل کے رہنے والے تھے لیکن والد نے تجارت کے سلسلے میں دہلی میں قیام کیا ۔ سودا شاہ عالم کے زمانے میں دلی ہی میں مقیم تھے اسی وجہ سے شاہ عالم نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا اور باقاعدہ اصلاح لینا شروع کر دی ۔ سودا نہایت خوش مزاج ، اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے ۔ جیسے جیسے ان کے علم میں وسعت پیدا ہوتی گئی ان کے حیات بھی لطیف و نفیس ہوتے گئے ۔ انھیں قدرت کی طرف سے عالمانہ دماغ اور شاعرانہ احساسات عطا ہوئے تھے ۔ انھوں نے اولاً فارسی میں اپنے جوہر دکھائے جو اس زمانے کا رواج تھا ۔ بعد کو اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ وہ اردو قصیدے کے بادشاہ ہیں اور دکنی شاعر نصیری کے بعد اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں سب سے اہم رتبے کے حامل ہیں ۔ انھوں نے فارسی کے اساتذہ خاقانی ، انوری اور عرفی جیسے قصاید نگاروں کے قصیدوں کے جو جوابات اردو میں لکھے ہیں وہ لاجواب ہیں ۔ وہ قصیدہ کے علاوہ غزل ، رباعی ، قطعہ ، مثنوی ، مسدس ، مخمس ، مستزاد اور مراثی وغیرہ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ سودا کی ہجویات ان کی زود رنج طبیعت کی غماز ہیں ۔

وہ آخر عمر میں فرخ آباد اور فیض آباد سے مراجعت کرتے ہوئے لکھنؤ آ گئے تھے اور اپنی عمر کے تقریباً ستر برس پورے کرنے کے بعد ۱۷۸۲ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا اور آغا باقر کے امام باڑے میں سپرد خاک کئے گئے ۔

میر حسن دہلوی

میر حسن دہلوی ثم لکھنوی — شمالی ہند کی پہلی طویل مثنوی ۔ سحر البیان کے مصنف کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گے ۔ سحر البیان دراصل قدیم فن شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس میں اپنے دور کے تمام لوازمات پورے عروج کمال پر نظر آتے ہیں ۔ گو کہ میر حسن نے دیگر مثنویاں بھی لکھی ہیں لیکن سحر البیان ایک ایسا زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے ۔ اس مثنوی میں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ افسانوی حقیقت کو بھی خاص درجہ حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مثنوی اپنے عہد کے سماجی اور ثقافتی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کا "تذکرہ شعرائے ہندی" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں اردو شاعروں کے مفصل حالات اور ان کے نمائندہ کلام کے نمونے تاریخی ترتیب کے اعتبار سے درج ہیں ۔

میر حسن کی ولادت دہلی میں ہوئی ۔ وہ ابتدائے شباب میں فیض آباد آئے اور پھر ترک سکونت کرکے لکھنؤ آئے ۔ انھوں نے دوران قیام لکھنؤ مثنوی سحر البیان کی تکمیل کی اور مثنوی کے تکملہ کے تین برس کے اندر ۱۷۸۶ء میں یہیں وفات پاکر سپرد خاک ہوئے ۔ ان کی قبر محلہ مفتی گنج میں قائم علی خان کے باغ کے عقب میں واقع ہے جہاں کا منظر قابل دید بھی ہے اور قابل عبرت بھی ۔

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ لکھنؤ کی شاعری کے امام اور دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ اردو شاعری کے اصول و ضوابط اور زبان و بیان کی اصلاح میں ان کا بڑا ہاتھ ہے ۔ دراصل غزل کی موجودہ شاعری کا نظام انھیں کی دین ہے ۔ از کار رفتہ الفاظ ، محاورات ، تشبیہات اور استعارات کی از سر نو تراش خراش کرکے انھیں قابل سماعت ، جاذب اور دلکش بنانے کا سہرا انھیں کے سر ہے ۔ سماعت پر گراں گزرنے

والے الفاظ کو متروک قرار دے کر ان کی جگہ نئے نئے الفاظ اور تراکیب کا رواج بے شک ناسخ کے ذہن کی پیداوار اور انھیں کا خاصہ ہے زبان و بیان کی تطہیر میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں تاریخ ادب اردو انھیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

آپ قدیم لکھنؤ میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے اور انتقال کے بعد ۱۸۳۸ء میں محلہ ٹکسال چوک میں دفن ہوئے۔ آج ادھر سے گزرنے والے لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ لکھنؤ کا اتنا عظیم شاعر اس "گوشۂ گمنام" میں اس طرح محو خواب ہوگا۔

ناسخ کے ساتھ اگر آتش کا نام لیا جائے تو دبستان لکھنؤ کی تشکیل کا تذکرہ قطعی طور پر نامکمل رہ جائے گا۔ خواجہ حیدر علی آتش نے شاعری کی محفل کو رنگ برنگے قمقموں سے آراستہ کر کے اس کی شکل ہی بدل دی۔ اور شاعری کو تکنیک سے متعارف کرانے کے سلسلے میں آتش نے اہم اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ان کا ذہن اور انداز فکر اردو شاعری کے کینوس پر ہمیشہ لفظوں کے نگوں کو آویزاں کرنے کا کام کرتا رہا۔ ان کے ادبی کارنامے لکھنؤ شاعری کی روح اور جان رہے ہیں۔ ان کے شاگردوں اور مشورہ لینے والوں کے ہجوم میں بھی بعض بڑے قابل قدر اور ناقابل فراموش صاحب قلم حضرات شامل ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا اور آپ یہیں ابدی نید سو رہے ہیں۔ تمام عمر ناسخ اور شاگردان ناسخ سے دو بہ دو مقابلہ کرنے والا شاعر اب کتنے اطمینان کے عالم میں ہے۔ اس کا اندازہ اس کی آخری آرام گاہ کے قریب سے گزرتے وقت ہو جائے گا۔

امانت لکھنوی

اندر سبھا اور امانت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ اگر امانت کو اردو ڈرامے

کا باوا آدم کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ حالانکہ وہ غزل، مرثیہ، واسوخت اور دوسری اصناف سخن پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ لیکن بسنت، ٹھمری، ہولی اور ساون وغیرہ میں انھوں نے اپنی جدت طبع کے مظاہرے کئے اور ایسا رنگ جمایا جو ان سے پہلے دہلی یا لکھنؤ کے شاعروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ان کے نغموں اور گیتوں کے بول عام طور پر ہندی میں ہیں اور اگر انھیں فارسی رسم خط کے بجائے ناگری میں لکھ دیا جائے تو ہندی ہی میں بآسانی شمار کیا جا سکتا ہے۔ امانت ہندی رس اور النکار کے بڑے پارکھ تھے اور انھیں ہندی موسیقی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ رعایت لفظی، خارجی مضامین، معاملہ بندی، نسائیت اور رقص و سرود کا بیان ان کے خاص موضوعات ہیں۔ وہ رزمیہ مرثیہ کے موجد تھے اور آخری عمر میں جب رعایت لفظی سے طبیعت بھر گئی تو چستیاں، معما اور پہیلی گوئی اختیار کی۔ وہ اس میں بھی داد کمال حاصل کر کے رہے۔

۱۸۵۸ء میں بمرض استسقاء انتقال کیا اور آغا باقر کے امام باڑے کے قریب بمقام مسافر خانہ دفن ہوئے۔ امانت واجد علی شاہ کے اختر نگر کے عیش خانوں کی صحیح تصویر کشی کرنے میں اپنا جواب آپ ہیں۔

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ
رضواں بھی ہے جناں میں ثنا خوان لکھنؤ

میر ببر علی انیس

میر ببر علی انیس خود لکھنؤ کے بہت بڑے مداح اور یہاں کی تہذیب کے پیرکار داں میں ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لکھنویت نے انیس اور انیس نے لکھنویت کے تصور پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ اردو ادب میں صنف مرثیہ گوئی کو انیس کی ذات سے بڑا استحکام حاصل ہوا۔ ان کی بیش بہا خدمات نے اردو کی رزمیہ شاعری

کو ایران کے فردوسی اور برطانیہ کے ٹینی سن کی تخلیقات کے مدمقابل لاکر کھڑا کر دیا۔ مرثیہ میں منظر کشی، فطرت نگاری اور حقیقت نگاری انیس کے خاص جواہرات ہیں جو ان سے پہلے اور بعد کے مرثیہ نگاروں کے یہاں برائے نام ہیں۔ میر انیس کی رزمیہ شاعری دراصل شاعرانہ کمالات اور تخیل کی بلند پروازی کا ایک حسین سنگم تھی۔ ان کے کلام میں شوکت الفاظ کے علاوہ فکر اور فن کا بھاری بھرکم پن بھی موجود تھا۔ یہی خصوصیات انھیں اپنے متقدمین اور متاخرین میں ایک درجۂ امتیاز کا حامل قرار دیتی ہیں۔

وہ صرف ایک مرثیہ گو کی حیثیت تک محدود نہ تھے بلکہ انھیں واقعات اہلبیت کا حقیقی مصور اور مورخ بھی سمجھنا چاہیے۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ اپنی ابتدائی عمر میں رباعی غزل گو کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ اور عروس فن کی مشاطگی کے فرائض انجام دئے۔ خود کہتے ہیں ؎

کسی نے تیری طرح سے اے انیسؔ
عروس سخن کو سنوارا نہیں

یا وہ اپنے حریفوں اور مخالفوں کو للکارتے ہوئے ان الفاظ میں صدائے عام دیتے ہیں ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

انیس کی شاعری میں جو آن بان، شان و شوکت اور زور و خم کا شائبہ ہے۔ وہ اصل میں ان کی ذاتی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے ہمیشہ صاف ستھری، بے ریا اور بے لوث زندگی گزاری۔ اسی لئے خوشامد، چاپلوسی اور تملق کے بجائے ان کے لہجے میں صاف گوئی، خودداری اور خود شناسی کو زیادہ دخل ہے۔ وہ قناعت پسند تھے اس لئے زندگی بھر دریوزہ گری کے بجائے

اطمینان اور سکون سے ہم کنار رہے۔ ان کا قیام چوبداری محلے کی ایک خاص وسیع اور کشادہ محل سرا میں تھا جو ان کی نشست گاہ بھی تھی اور تخلیق گاہ بھی۔ وہ آخری عمر تک اسی محل سرا میں مقیم رہے اور اس کے ایک گوشے میں تخلیقی کام کرتے رہے اور درباداری سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ ان کے ارد گرد خود ایک دنیا آباد تھی جو ان کے گھریلو ماحول اور ادبی زندگی پر مشتمل تھی۔ زمانے کے رسم و رواج اور روایتوں سے قطع نظر ان کا علیحدہ ایک طرز زندگی تھا جس پر وہ تمام عمر عامل اور کاربند رہے۔ انھوں نے اس خیال کو عمدگی کا جامہ پہنا کر مندرجہ ذیل شعر کہا ہے جس میں زندگی کے فانی ہونے کا اشارا بھی مضمر ہے ؎

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو اسی محل سرا میں ان کا انتقال ہوا۔ جو قریب ہی ایک باغ میں دفن ہوئے۔ پہلے مزار ان کا کچھ سونا سونا تھا بعد کو پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نگرانی میں اس کی تعمیر نو ہوئی، مزار کو مقبرے کی شکل دے دی گئی۔ سرکٹے نالے سے لے کر پرانی سبزی منڈی تک سڑک کا راستہ "میر انیس روڈ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور چند برس قبل ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر حکومت ہند نے محکمہ ڈاک کے ذریعہ ان کے نام سے ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ کا اجرا کر کے ان کی دیرپا ادبی خدمات کا اعتراف کر چکا ہے۔ اردو زبان میں تو ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی عالمی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ

مرزا سلامت علی دبیرؔ انیسؔ کے ہم عصروں اور حریفوں میں سرفہرست ہیں۔ خیال اغلب ہے کہ اگر دبیرؔ میر صاحب کے مدمقابل نہ ہوتے تو شاید ان کی مرثیہ

گوئی اور رزمیہ شاعری کا یہ عروج نہ ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ گوئی کے میدان میں دبیر انیس کے مقابلے میں اگر بیش نہیں تو انیسؔ بھی ہرگز نہ تھے بلکہ ؎

برابر کے معرکے میں دونوں غول کے

دبیر بعض جگہوں پر انیس سے آگے نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ مولانا شبلی نعمانی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر دبیر کے مقابلے میں انیس کو افضل اور برتر ثابت کرنے کی ہر چند کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو مثالیں انھوں نے دی ہیں ان کی رو سے بھی وہ انیس کو دبیر پر افضلیت کا درجہ دلانے میں ناکام رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ شعراء اور ادباء کے مابین ادبی چشمکیں ہمیشہ چلتی رہی ہیں لیکن ان مقابلوں اور زور آزمائیوں میں وقتی طور پر برتری حاصل کرنے والی شخصیت کے مقابلے میں اس کے حریف کی حیثیت کبھی اس پر کم نہیں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے مقابلے میں سودا، غالب کے ساتھ ذوق، ناسخ کے ساتھ آتش، انیس کے ساتھ دبیر، شرر کے ساتھ چکبست، اور صفی کے ساتھ یگانہ کا نام بھی ہمیشہ طالبان ادب کے ورد زبان رہا ہے۔ غرضکہ دبیر بھی انیس سے کچھ کم درجے کے شاعر نہ تھے۔ لیکن ان کی بعض کمزوریوں نے انھیں انیس کے مقابلے پر دوسرے نمبر کا شاعر بنا دیا تھا۔ بہرحال اس سے ان کی عظمت میں کوئی نمایاں کمی نہیں واقع ہوتی۔ اس لئے کہ مرزا صاحب طبیعتاً بڑے سادہ لوح واقع ہوئے تھے اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں بھی زیادہ تر سیدھے سادے لوگ شامل تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ انیس اور ان کے تلامذہ پر قابو نہ پا سکے۔ وقتی طور پر پسپا ہونے ہی کو انھوں نے نوشتۂ دیوار سمجھا اور خاموش رہے۔ ورنہ فن اور شاعری میں تو وہ کسی طرح انیس سے کم درجے کے آدمی نہ تھے۔

اپنی ذاتی زندگی میں بھی دبیر بڑے سکون طلب، اطمینان پسند اور قناعت واقع ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے خاموشی پر اکتفا کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔

وہ معمولی باتوں کو خاص توجہ دے کر قابل ذکر بنانے کے عادی نہ تھے۔ اسی لئے ہمیشہ نقصان میں رہے۔ اور اپنی اس کمزوری کی قیمت چکاتے رہے۔

دبیر قدیم لکھنؤ کے محلہ نخاس کے رہنے والے تھے۔ جب ۱۸۷۵ء میں انیس کا انتقال ہوگیا تو انھوں نے ترک شاعری کرنے کا اعلان ان لفظوں میں کیا۔

"جب انیس ہی نہ رہے تو اب میں شاعری کس کے لئے کروں"

وہ انھیں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

آسماں بے ماہ کامل سر رہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد رشید آغا ہجو شرف نے دونوں کی تاریخ وفات ایک ہی مصرعے سے نکالی ہے ؎

ہے ہے غم انیس میں، غم ہے دبیر کا

۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

مرزا دبیر کی تدفین بھی ان کے آبائی مکان ہی میں ہوئی۔ وفات کے بعد ان کے جائے رہائش کو جانے والی رہ گزر کا نام "مرزا دبیر لین" رکھ دیا گیا جس کی پاسداری اور پاسبانی کے لئے شہر لکھنؤ کا بلدیاتی ادارہ اب بھی موجود ہے۔ حالانکہ آج دبیر موجود نہیں ہیں لیکن ان کا نام اب بھی باقی ہے اور تا دیر باقی رہے گا۔ صاحبان ادب اور خصوصاً اہل لکھنؤ ان کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

موازنہ۔ دبیر اور شبلی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اسے اردو ادب کی بدنصیبی ہی کہئے یا اہل ادب کی ستم ظریفی کہ ہمارے یہاں ایک دور میں صرف ایک ہی شاعر یا فنکار کو قبولیت کی سند ملتی ہے۔ آپ اردو ادب کی مکمل تاریخ کی ورق گردانی کر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرؔ کی اسی "سند قبولیت" نے سوداؔ، میر حسنؔ، اور میر دردؔ وغیرہ کا رنگ اپنے سامنے جمنے نہیں دیا مصحفیؔ اور سید انشا کی چشمک بھی کچھ کم نہ تھی۔ غالبؔ کی عظمت اور شہرت نے مومنؔ اور داغؔ وغیرہ کو اپنی ہمہ گیری کی لپیٹ میں لے لیا۔ ناسخؔ اپنے ہم عصروں پر "فوقیت" حاصل کرنے کے لئے آتشؔ جیسے کامل استاد فن کا چراغ گل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انیسؔ کے معترضین نے دبیرؔ کو ایسا گھٹایا کہ ان کی ساری عمر کی شاعرانہ بضاعت، اور اردو ادب کے تئیں ان کی بیش بہا خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ انھیں شعراء کی طرح ... دور میں مصحفیؔ کے مقابلہ میں یگانہ کو دو نمبر کا شاعر یا فنکار ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کیا گیا۔

حالانکہ یہ صرف شخصیت پرستی اور علاقائی عصبیت کا نتیجہ تھا جس کی بنا پر سوداؔ، میر حسنؔ، میر دردؔ، انشاؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، آتشؔ، دبیرؔ اور یگانہ جیسے باکمال اور اپنے اپنے دور کے یگانۂ روزگار شعراء کو ایک مخصوص تعریفی عینک لگا کر دیکھا گیا ورنہ مذکورہ بالا تمام شعراء اپنے فنکارانہ کارہائے نمایاں کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں علیحدہ علیحدہ نمایاں، منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی استادانہ حیثیت اور تخلیقی کارناموں کی وجہ سے اردو ادب میں شہرت دوام اور قبولیت عام حاصل ہے

یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی گروہ بند تخریبی قوتیں برسرکار رہی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں نہ صرف یہ کہ اپنے پسندیدہ فنکاروں کو غیر ضروری بڑھاوا دیا بلکہ ان کے مذکورہ بالا آخر الذکر کو ہم عصر حریفوں اور مدمقابلین کو ان کے سامنے نیچا دکھا کر ان کی اصل شاعرانہ شخصیت اور حیثیت کو مسخ کرنے کی دیوانہ وار کوشش کی ہے۔ میر، مصحفی، غالب، ناسخ، انیس اور دبیر اپنے اپنے عہد کے نمائندہ اور لافانی شاعر اور فنکار ضرور ہیں لیکن یہ سب کے سب لافانی قطعی نہیں ہیں۔ ان کے ہم عصروں نے بھی انھیں کی طرح اپنی عمریں ادب کی خدمت میں گزار دیں اور برسہا برس بلکہ تا زندگی اپنے خون جگر سے اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں اس لئے ان کی شاعرانہ عظمت یا ... حیثیت سے انکار کرنا قطعی ممکن نہیں بلکہ ان کی استادانہ حیثیت سے چشم پوشی ایک ادبی گناہ اور کفران نعمت ہے۔

اس خیال کی روشنی میں ہمیں صرف دبیر کی شخصیت اور ان کی فنکارانہ حیثیت کے بارے میں ایک واضح اور شعوری نقطہ نظر قائم کرنا ہے۔ کہ ان کے کلام کے کون سے ایسے تشنہ اور کمزور پہلو ہیں جو انھیں اپنے مدمقابل اور حریف میر انیس کے مقابلہ میں پست قرار دیتے ہیں۔ کون سی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو انھیں نہ صرف اپنے مدمقابل حریف بلکہ اردو دنیا کے تمام مستند فنکاروں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام پر فائز کرتے ہیں۔ انیس اور دبیر کے متعلق اردو ادب میں سب سے اہم جائزہ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف انتخابات شبلی یعنی "موازنہ انیس و دبیر" ہے مولانا شبلی نے "موازنہ" میں انیس و دبیر کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ ان دونوں کے کلام میں موجود جملہ خصوصیات و معائب شعری سے بحث کرتے ہوئے میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت اور برتری کا درجہ دیا ہے۔ حالانکہ ادب میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اپنی پسند کو دوسروں پر زبردستی لادا جائے، اپنے پسندیدہ کلام کی ہزاروں تعریفیں کر کے اس کی عظمت اور برتری کا لوہا منوانے

میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اور جو کلام یا شاعر ناپسندیدہ یا کم پسندیدہ ہو اس کے کلام کی عیب جوئی کر کے اسے کمتر اور گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش کی جائے یہ کسی شاعر یا اس کے کلام کے ساتھ انصاف نہ ہوا۔ اس لیے کہ کلام بہر حال کلام ہے وہ انیس کا ہو دبیر کا یا کسی اور شاعر کا، اس میں فنکاری کی جگہ جگر کاری اور ذہن سوزی ضرور شامل ہوتی ہے۔ اس صورت میں انیس کے مقابلہ میں دبیر کے بالکل نہ ہونے کے برابر ثابت کرنے کی کوشش میں ان کے ساری عمر کے تخلیق کئے ہوئے کلام کی ہزاروں خصوصیات اور محاسن کو نظر انداز کر دینا بھی نہ تو انصاف کی بات ہے اور نہ اسے ادبی دیانتداری ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

تنقید ادب کی کسوٹی ہے اور ہر ناقد کے لئے ادبی دیانتداری بہت ضروری ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ زیر نظر کلام کے معائب اور محاسن کا جائزہ لینے کے بعد اپنی صحیح اور صائب رائے سے ناظرین کو آگاہ کرے نہ کہ وہ خود جذبات اور تاثرات سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ اسے اچھے اور برے میں امتیاز باقی نہ رہے۔ مولانا شبلی بھی "موازنہ" میں بہت جذباتی اور تاثراتی انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کی تصنیف کے شروع کے چند صفحات دیکھنے کے بعد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ انیس کے طرفدار ہیں اور ان کے مقابلہ میں دبیر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ پھر پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہے اس کی کوئی معقول وجہ ظاہر نہیں ہوتی۔ بہر حال یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ابتدا سے انتہا تک انیس کے معترف ہیں اور دبیر کے کلام کا ان کی نظر میں کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیس و دبیر کے کلام کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اکثر انھوں نے دبیر کے اچھے شعر یا مصرعہ کو گھٹیا اور انیس کے کمزور شعر یا مصرعہ کو اعلیٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ چونکہ مولانا نے جانبداری سے کام لیتے ہوئے اپنی رائے اور استدلال کی مہر ثبت کر دی ہے۔

اس لئے نفسیاتی طور پر دبیر کا کلام انیس کے مقابلہ میں کمتر محسوس ہونے لگتا ہے لیکن اگر مولانا کے "سرٹیفکیٹ" کو نظر انداز کر کے دونوں بزرگوں کے کلام کو بغور پڑھ لیا جائے اور ان میں معائب و محاسن کی چھان بین کی جائے تو خوبیاں اور خرابیاں دونوں ہی کے کلام میں تقریباً یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

خود مولانا شبلی نے اپنے رائے اور پسند تو انیس کے حق میں ظاہر کی ہے لیکن کہیں کہیں شدت جذبات میں ان کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جنھیں شاید وہ کہنا نہ چاہتے ہوں۔ اس لئے اگر مجبور ہو کر کہیں پر انھوں نے مرزا دبیر کے کلام کی تعریف بھی کی ہے تو وہ بہت دبے الفاظ میں اور تعریف کرتے ہی تنقیص کا کوئی پہلو نکال کر خود اپنے ہی بیان کی تردید کر دی ہے اس طرح بعض جگہوں پر انھوں نے کلام انیس پر بہت خفیف اور ہلکی ضربیں لگائی تو ہیں مگر فوراً ہی ان کی کسی نمایاں خصوصیت کا ذکر کر دیا ہے جس کے سامنے وہ دب کر رہ جائیں۔ مولانا نے جہاں انیس کے کلام کی بڑے زور و شور سے تعریف کی ہے اسی کے مقابلہ میں دبیر کے سلسلہ میں بھی انھیں کی تحریروں سے اتنے ہی زوردار توصیفی جملے تلاش کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہے۔ مثلاً ایک جگہ مرزا دبیر کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"الفاظ میں فصاحت" سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی و دلآویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے، فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی ہے۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ عاجز ہیں، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکے۔"

اس تحریر کے نظر سے گزرتے ہی ایک خیال پیدا ہوتا ہے اور ایک سوال۔ خیال تو یہ ہے کہ مولانا نے یہ فیصلہ یک طرفہ طور پر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حد تک ان پر جانبداری کا الزام بھی ہو سکتا ہے اور سوال یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے کلام میں مذکورہ بالا ایسے تمام خصائص (اور محاسن) سرے سے موجود ہی نہیں ہیں جو اچھے شعر کی جان ہی نہیں بلکہ اصول شعر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں تو پھر وہ کون سے اسباب اور وجوہات ہیں جنھوں نے مرزا دبیر کو میر انیس جیسے عظیم شاعر کا ہم پلہ حریف اور مد مقابل قرار دیا۔ خود مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

"اردو علم و ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا اور یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔"

پھر آگے چل کر مرزا دبیر کے کلام میں پائی جانے والی نادر تشبیہات اور استعارات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ موازنہ کے صفحہ ۱۷۱ لغایت ۱۸۵ پر ضرب تلوار کی تعریف میں مرزا صاحب کے اکتالیس شعر مثال کے طور پر پیش کرنے کے بعد رائے زن ہیں۔

"اسی طرح مضامین میں سیکڑوں ہزاروں نئی تشبیہیں، استعارات اور باریکیاں پیدا کی ہیں۔ ہم نے اس خیال سے صرف نمونہ پر اکتفا کیا کہ جو شخص ایک تلوار کے متعلق اس قدر بے شمار مضامین کا مینہ برسا سکتا ہے اس کی قوت متخیلہ کی کیا حد ہو سکتی ہے۔"

مضمون بندی اور خیال آفرینی کے سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا خود پر اپنی مقرر کی ہوئی سرحد کے باہر نظر آتے ہیں اس موقع پر انھوں نے کس کر مرزا صاحب کی تعریف کی ہے۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے اور قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈھ پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔"

تشبیہات اور استعارات کے باب میں بھی اسی طرح کا بیان ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو موازنہ صفحہ ۱۷۵۔

"مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی خیال آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا۔"

مرزا دبیر کے کلام میں پائی جانے والی نادر تشبیہات اور استعارات کی اس قدر توصیف کرنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ انیس کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ۔

"تشبیہ کی خوبیاں جس قدر انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں اردو زبان میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔"

بیانات کے اختلاف کی حد ہو گئی ایک طرف تو انھیں کے بقول دبیر ایسی تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہو سکتا۔ وہ سکڑوں، ہزاروں ایسی تشبیہیں پیدا کرنے میں ماہر ہیں جہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ لیکن دوسری طرف موزنا نے ان کے خاص حریف میر انیس کی تشبیہات کو اردو زبان میں لاجواب بتایا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اگر دبیر تشبیہات کے سلسلہ میں انیس پر فوقیت رکھتے تھے تو مولانا کو اس حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی ادبی دیانتداری کا ثبوت دینا چاہیئے تھا۔ جیسا پہلے ہی تحریر کیا جا چکا ہے مولانا نے جہاں کہیں موازنہ کرنے کا حق ادا کرنے کے لئے دبیر کی تعریف یا اعتراف کیا ہے وہاں بہت دبے الفاظ استعمال کئے ہیں

موازنہ کے صفحہ ۲۱۰ پر دونوں شعراء کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ میں عموماً میر انیس کی ترجیح ثابت ہوگی لیکن یہ کلیہ میں مستثنیٰ ہوتا ہے بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا تھا

دونوں شعراء کے ہم مضمون اشعار کے بارے میں بھی مولانا نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا ہے ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مرثیہ چند مخصوص واقعات اور حادثات کی تصویر کشی کا دوسرا نام ہے اس لیے جتنے شعراء نے مرثیہ گوئی پر توجہ کی وہ ایک ہی قسم کے واقعات کو نظم کرنے کے لیے مجبور رہے۔ لیکن دوسری طرف وہ انیس اور دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے متحد المضمون مراثی اور اشعار کے بارے میں دبیر کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ دبیر نے سرقہ کیا۔ بایں کہ انیس نے جب ان پر سرقہ کا الزام لگایا تو انھوں نے ان پر زوردار جوابی الزام لگانے کے بجائے صرف اپنی صفائی پیش کی پھر مولانا اس بارے میں بھی مشکوک ہیں کہ جو ہم مضمون مراثی اور اشعار دونوں کے یہاں پائے جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں پتہ کہ پہلے انیس نے کہے دبیر نے تقلید کی یا دبیر نے کہے اور انیس نے تقلید کی۔ مولانا نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ حقیقت بے نقاب ہو جائے اور حالات کی صحیح تصویر سامنے آسکے۔

موازنہ کے صفحہ ۱۹۲ پر مولانا اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ دونوں صاحبوں کا انداز شاعری بالکل الگ الگ ہے تاہم واقعات اور مضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دونوں حریفوں نے اکثر مرثیے اور بند اور متفرق اشعار ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بعض بندوں میں مضمون ردیف اور قافیے تک

مشترک ہیں۔ افسوس ہے کہ ان موقعوں پر پتہ نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا ....."

مولانا نے اس اعتراض کے باوجود۔ کہ یہ نہیں معلوم کس نے پہلے کہا اور کس نے بعد میں۔ فوراً ہی یہ بھی لکھا ہے کہ میر انیس اکثر شعروں میں مرزا دبیر پر سرقہ اور خوشہ چینی کی چوٹ کرتے ہیں اور انھوں نے انیس کے مندرجہ اشعار ثبوت کے طور پر پیش کئے ہیں جن سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ انیس نے یہ اشعار دبیر ہی کے لئے کہے تھے اور ان کا مفہوم سرقہ کے سلسلے کا ہی ہے اشعار دیکھئے:۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کر دو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
نوا سنجیوں نے تری اے انیس
ہر ایک زاغ کو خوش بیان کر دیا
پیاسو، پیو سبیل ہے نذر حسین کی
مضمون انیس کا نہ چسہ بہ اترا

ان تمام اشعار اور مصرعوں کو دیکھنے کے بعد کوئی ضروری نہیں ہے ہر شخص یہی سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ انیس کے مخاطب دبیر ہی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمام ہم عصروں پر چوٹ ہو، اس لئے کہ قدماء کا یہ اصول رہا ہے کہ وہ فخریہ انداز میں چند ایسے اشعار ضرور کہہ دیتے تھے جن میں ان کی انفرادیت اور عظمت کا ذکر ہو۔ ایسے اشعار اردو کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں جن میں اس نے خود اپنی تعریف و توصیف کی ہو۔ ولی سے لے کر میر اور غالب سے اقبال تک کسی کا کلام اس علت سے پاک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے انیس نے بھی یہ اشعار محض خود نمائی کے لئے یا اپنی شخصیت کے فخریہ بیان کے سلسلہ میں موزوں کئے ہوں ان کا روئے سخن تمام ہم عصروں کی طرف ہو۔ پھر مولانا کو دبیر کی طرف سے اسلئے

مزید شک پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے میر انیس پر کہیں سرقہ کی تعریفیں نہیں کی بلکہ صرف برائت ظاہر کی ہے۔ اس کی مثال میں دبیر کا یہ شعر لکھا ہے:۔

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

مذکورہ شعر کا مفہوم مولانا نے یہ اخذ کیا ہے کہ دبیر نے اس میں اپنی صفائی پیش کی ہے کہ ان کا کلام سرقہ سے پاک صاف ہے حالانکہ اسی شعر کو اس مفہوم کے ساتھ بھی قبول کیا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیر نے اپنے حریف خاص انیس یا دوسرے ہم عصروں پر چوٹ کی ہو کہ ان لوگوں کے کلام میں تو سرقہ ملتا ہے لیکن دبیر بذات خود مرثیہ فن گوئی میں طرز جدید کے موجد ہیں اور کسی کی تقلید یا پیروی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بقول مولانا کے انیس نے اپنے اکثر اشعار میں مرزا دبیر پر سرقہ کا الزام لگایا ہے اور ان پر چوٹ کی ہے۔ اگر اس بیان کو بغیر کسی ترمیم و توصیف کے تسلیم کر لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ انھوں نے ان الزامات کا واضح طور پر کوئی جواب نہ دے کر اپنے اوپر شک کی گرفت مضبوط ہونے کا موقع دیا لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب انیس کی طرف سے ان پر مسلسل اس طرح کے حملے ہوتے ہی رہتے تھے تو آخر انھوں نے اس سے بیزاری ظاہر کرنے کے بجائے بذات خود انیس کی شان میں توصیفی شعر کیوں کہے اور اپنا خاص مدمقابل اور حریف ہونے کے باوجود انہیں اتنے بڑے رتبے سے کیونکر نوازا جیسا کہ حسب ذیل شعر سے ظاہر ہے۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

مذکورہ بالا تمام اقتباسات نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے

کہ مرزا دبیر معاصرانہ چشمک، عیب گوئی اور دشنام طرازی سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور خود کو اس آلودگی سے پاک رکھنے کے لئے انھوں نے اپنے حریف کے الزامات کے جواب دینے میں کبھی انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ "ہر سوال را جواب ندارد" کے مصداق نہ صرف خاموشی اختیار کر کے بلکہ اپنے مدمقابل اور حریف کی تعریف و توصیف کر کے اپنی وسیع النظری اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ اگر مولانا شبلی دبیر کے اس جوہر انسانیت کو حالات کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو یہ ان کا بڑا کارنامہ اور دبیر کی شخصیت نیز ان کے فن کو مولانا کی تصنیف سے وہ دھچکہ نہ لگتا جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک المناک سانحہ بن کر رہ گیا ہے۔

کسوٹی پر پرکھنے کے بعد انھیں باقاعدہ موضوع کی شکل دیتا ہے۔ پھر موضوع کے خاکے پر تخلیق کی دیواریں اٹھتی ہیں اور رفتہ رفتہ ایک ایسا شاندار محل تعمیر ہو جاتا ہے، جسے عام طور پر فنی شاہکار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہر فنی شاہکار اپنی ہیئت اور ساخت و پرداخت کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ موضوعات تلاش کرنے کے لئے باریک بینی اور نکتہ سنجی کی ضرورت ہر لمحہ فنکار کے ذہن کے پردوں پر مضراب زنی کرتی رہتی ہے۔

زیر نظر مجموعۂ مضامین "کینوس کے رنگ" ایسے ہی چند موضوعات پر مشتمل مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، جو ادب کے عصری تقاضوں، وقت کی سمت و رفتار، شام اودھ اور "شہر نگاراں" کے چند یادگار مرقعوں اور قومی و وطنی کیف و کم کے حامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر مضامین ان فنکاروں کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں جن کی اعلا ذہانت و ذکاوت نے تاریخ اردو میں انھیں روشن اور تابندہ کر دیا ہے۔ البتہ بعض موضوعات ایسے بھی ہیں جن کی روشنی میں ان ادبی ناانصافیوں کا ذکر بھی آیا ہے جن کے سبب تاریخ اردو، اردو دوستوں اور طالب علموں، سب کو صدمہ پہونچا ہے۔ کچھ مضامین قوم و وطن کے موضوعات سے متعلق ہیں اور کچھ غیر ممالک مثلاً ایران و عرب کے جغرافیائی حالات، تمدن اور زبان وغیرہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ اردو زبان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اسی لئے اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو.....

ٹھمری

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

لکھنؤ --- گہوارۂ تہذیب و تمدن ہونے کے ساتھ ساتھ گہوارۂ حسن و جمال بھی ہے۔ یہاں کی ہر ادا خوبصورت اور ہر چیز دلکش ہے --- لکھنؤ کا تکلف، یہاں کی وضع داری اور روایتی مہمان نوازی --- ہر چیز میں ایک حسن ہے --- یہاں انداز گفتگو کی چاشنی، نشست و برخاست کی تمیز اور رہنے سہنے نیز زندگی گزارنے کے آداب ہر چیز میں بلا کی لکھنوئیت جھلکتی ہے۔

لکھنؤ کی خوبصورتی اور اس کے حسن و جمال ہی سے متاثر ہو کر شعراء نے اُسے "شہر نگاراں" --- یعنی خوبصورتوں اور شیریں مقالوں کا شہر قرار دیا ہے۔ گویا کہ لکھنؤ غزل کے روایتی محبوبوں کا شہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں غزل کو لکھنؤ کا محبوب کہا جا سکتا ہے --- غزل اور لکھنؤ کو ایک دوسرے کا عاشق و معشوق اور لازم و ملزوم کہنا اور زیادہ مناسب بات معلوم ہوتی ہے۔

اس لئے کہ لکھنؤ نے ہمیشہ غزل کو اپنی آبرو بنائے رکھا اور اہل لکھنؤ نے غزل پر ہمیشہ اس طرح جان دی کہ وہ خالص یہیں کی چیز بن کر رہ گئی۔

کبھی مہاراج بندرادین کی حویلی سے غزل کے راگ آئے --- کبھی شمبھو اچھن اور برجو مہاراج کے ہونٹوں سے شیرینی اور دلکشی کا پیکر بن کر نگاہوں کے سامنے آئے۔ اور --- اہل لکھنؤ کے ذوق سماعت کو مدتوں متاثر کرتے رہے۔

کبھی غزل کے روایتی آہنگ نے بیگم اختر کی جادو بیانی کا رنگ اختیار کیا۔ اور ان کے خاص انداز میں رچ بس گئی ؎

ترنم میں ڈھل کر اجل سو گئی
سروں کو جگا کے غزل سو گئی

اسی لکھنؤ نے غزل کے میدان میں طلعت محمود جیسی عظیم غزل گایک کے زندہ کارناموں پر اپنا سر فخر کے ساتھ بلند کیا۔ طلعت محمود نے میدان غزل میں ماضی قریب سے حال کا رشتہ جوڑنے میں ایک آہنی زنجیر کا کام کیا۔ اور۔ غزل کی روایت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جن فنکاروں تک پہونچی ہے ان میں سے بیشتر آج ہمارے درمیان موجود ہیں اور آج کے "غزل راگ" پروگرام میں آپ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔

غزل گوئی کی دنیا میں اگر۔ میر، مومن، غالب، داغ، آرزو، اور جگر محتاج تعارف نہیں ہیں۔ تو۔ غزل گایکی کے میدان میں۔ اقبال صدیقی، عبدالحئی، انجنا بنرجی، انجنا چترجی، سمتا چترجی اور ایس کے ماتھر بھی اپنا جواب آپ ہیں۔

آج کے "غزل راگ" پروگرام کی خصوصیت یہی ہے کہ اردو ادب کے کلاسیکی اور ماضی قریب سے تعلق رکھنے والے چند شعراء کی منتخب غزلیں۔ موجودہ دور کے منتخب غزل گایکوں کی شیریں اور دلکش آوازوں میں آپ کے سامنے پیش کی جائیں۔

اس تقریب کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ اردو غزل کے رنگ و آہنگ کو ساز و آواز کی رنگینیوں کا لباس پہنایا جائے اور اس طرح ان روایات کو دہرایا جائے جو ہمیشہ سے لکھنؤ کے دامن دولت پر ایک حسین نقش کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میر تقی میرؔ

خدائے سخن میر تقی میرؔ تاج محل کی سرزمین اکبر آباد یعنی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ دلّی میں گزارا۔ آخری عمر میں دلّی کی تباہی سے متاثر ہو کر آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ چلے آئے۔ یہیں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

میرؔ نے زمانے کے سرد گرم کو چکھا تھا۔ اس کی چوٹیں سہی تھیں۔ جگہ جگہ رہے تھے۔ وقت کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا تھا۔ عام انسانوں کی خوشیاں اور غم محسوس کیے تھے۔ بدسلوکی اور افلاس کی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ اور دردمندی کا لطف اٹھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حسن و صداقت کا ایسا گہوارہ ہے جس میں زندگی کی حکایت مسکرا رہی ہے۔ انھوں نے اپنا آشیانہ انسانوں کی بستی سے دور نہیں بنایا بلکہ ان میں گھل مل کر عوام کے دل کی دھڑکنوں کو پیش کیا ہے۔

میرؔ کا کلام پیش کر رہی ہیں مس انجنا بنرجی۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے

سُرمہ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی

حکیم مومن خاں مومنؔ دہلی میں پیدا ہوئے اور ۵۳ سال کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔ مومنؔ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو صرف غزل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کی غزل میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن سب سے بڑی خوبی یہی ہے انھوں نے غزل کو صرف عشق و محبت تک محدود رکھا۔ اگرچہ بعض لوگ اسے مومن کی کمزوری خیال کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی طاقت تھی۔ انھوں نے اس محدود دائرے میں جو وسعتیں پیدا کیں وہ شاید کم شعراء کے حصے میں آئیں۔ وہ نہ فلسفے کے "مبلغ" ہیں نہ اخلاق کے "پرچارک" اپنی غزل میں وہ صرف ایک شاعر اور آرٹسٹ نظر آتے ہیں۔ مومنؔ نے اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور اسی سے مخاطب ہوئے۔ انھوں نے غزل کے سب سے اہم وصف یعنی رمزیت کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس نے مومنؔ کی شاعری کو بالکل انفرادی رنگ بخش دیا۔

ریڈیو کے مقبول فنکار عبدالحئی مومن کا کلام پیش کر رہے ہیں:۔

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

آج اس بزم میں طوفان اُٹھا کے اُٹھے
یاں تک روئے کہ اس کو بھی رُلا کے اُٹھے
دل سے کیوں کر نہ دُھواں ساتھ ہوا کے اُٹھے
شعلہ ہائے تپِ غم سینہ جلا کے اُٹھے
اُف رے گرمیِ محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے
گر نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود
درد کیا کیا اثر خفتہ جگا کے اُٹھے
جی ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا
پاؤں کیا کوچے سے اس ہوش رُبا کے اُٹھے
شعر مومنؔ کے پڑھے بیٹھ کے اس کے آگے
خوب احوالِ دلِ زار سُنا کے اُٹھے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

غالبؔ بنیادی طور پر اپنے آپ کو فارسی کا شاعر قرار دیتے تھے اور اپنی اُردو شاعری کو "بے رنگ" قرار دینے میں فخر بھی محسوس کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرزا کے فارسی کلام کو دیکھتے ہوئے۔ کمیّت اور کیفیت میں ان کا اردو کلام "نہیں" کے برابر ہے پھر بھی ان کی شہرت کا باعث یہی "بے رنگ" اردو کلام ہے۔ جس کی تہیں وقت کے ساتھ کھلتی ہی چلی جا رہی ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری نے فرطِ عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستان کی صرف دو الہامی کتابیں ہیں۔ "وید مقدس" اور "دیوان غالب"۔ بجنوری کا بیان مبالغہ پر مبنی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے۔

غالبؔ کے کلام کی افادیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔
اکثر لوگوں کو غالبؔ کا کلام "گنجینہ معنی کا طلسم" نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ طلسماتی کرشمہ سازی اتنی دلچسپ ہے کہ اگر ایک مرتبہ آپ اسے حل کرنے بیٹھ جائیں تو معنی کے ایسے ایسے پردے اٹھیں گے کہ عقل حیران ہو کر رہ جائے گی ۔
کلام غالبؔ انجنا چرڑجی کی آواز میں سماعت کیجئے ۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

نواب مرزا داغؔ دہلوی

نواب مرزا داغؔ دہلوی ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دلّی میں پیدا ہوئے ۔ داغؔ

کی زندگی کا ابتدائی حصہ قلعہ معلّی میں گزرا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد رامپور پہونچے۔ آخر عمر حیدرآباد میں گزاری۔ وہیں ۱۶ر فروری ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا۔

بقول ڈاکٹر نیر مسعود عظیم شاعروں کی صف میں، داغ کو جگہ نہیں ملی ہے اور اس اعزاز کے لئے ان کی سفارش بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کا مکمل اور خالص شاعر ہونا مسلّم ہے۔ اس لئے کہ ان کا شعری اسلوب ان کے مضامین سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ داغ کا سارا کلام پڑھ جائیے۔ کہیں بھی یہ احساس نہ ہوگا کہ اگر یہ مضمون کسی اور طرح ادا کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

یہ خصوصیت داغ کو نہ صرف اردو غزل کا چابکدست استاد ٹھہراتی ہے بلکہ انھیں کامیاب ترین شاعروں کی صف میں بھی لے آتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ داغ کی غزل کا محبوب اردو غزل کے روایتی محبوب سے مختلف نہیں۔ البتہ اس سے زیادہ جاندار ہے۔ اور داغ کا عشق بھی اردو غزل کے روایتی عشق سے مختلف نہیں۔ لیکن۔ اس سے زیادہ حقیقی، یعنی مجازی ہے۔

انجنا چرجی داغ کا کلام سنا رہی ہیں:۔

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے مے کشوں سے لطفِ شراب
یہ مزا پاک باز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو مُزے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

انور حسین آرزو لکھنوی

سید انور حسین آرزو ۱۷ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی اور اردو کے مشہور استاد میر ضامن علی جلال سے تلمذ حاصل کیا۔ اور آگے چل کر ان کے جانشین بھی ہوئے۔

آرزو لکھنوی جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف مذہبیات میں کافی دخل رکھتے تھے تو دوسری طرف بمبئی اور کلکتہ کی فلم کمپنیوں سے بھی وابستہ تھے۔ جہاں انھوں نے متعدد فلمی گیت، کہانیاں اور مکالمے لکھے۔

انھوں نے اپنی غزلوں اور گیتوں میں جو مترنم بحریں استعمال کی ہیں وہ فن موسیقی کے رموز و نکات سے ان کی واقفیت کی شاہد ہیں۔

ایک عام خیال یہ تھا کہ اردو شاعری میں فارسی اور عربی کے الفاظ کے بغیر کوئی نادر یا بلند پایہ مضمون نہیں پیش کیا جا سکتا۔ لیکن آرزو لکھنوی نے اپنی کتاب "سریلی بانسری" لکھ کر اس خیال کی تردید کر دی۔ اور۔ ایک ایسی گنگا جمنی زبان کو اپنایا جو عوام کے لئے زیادہ سے زیادہ پسندیدہ ہو۔

آرزو کی غزلیں مشہور غزل گایک جناب اقبال صدیقی سے ان کی سحر آفریں آواز میں سنیئے:۔

اول شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

توڑ کے قید کو نکلا جب میں اٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا دیوانہ بھی
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی
دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلا جب کوئی بگولہ دوڑ پڑا دیوانہ بھی
غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی
حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی
دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

علی سکندر جگر مرادآبادی

رئیس المتغزلین علی سکندر جگر مرادآبادی کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے شعر و سخن کے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ اور پروان چڑھے۔ ذوق سخن خداداد تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے عروس سخن کے گیسو سنوارنے لگے۔ پہلے اپنے والد علی نظر سے اصلاح لی۔ اس کے بعد داغ اور تسلیم سے بھی استفادہ کیا۔ لیکن سب سے زیادہ متاثر اصغر گونڈوی سے ہوئے۔

جگر کو غزل گوئی سے فطری مناسبت تھی۔ غزل ہی ان کی بے چین طبیعت، ان کے بے قرار دل، ان کے جذبات و احساسات اور خیالات کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ موزوں صنف تھی۔ جگر کو جسم و جان و روحِ غزل اور غزل کو جسم و جان و

فارسی زبانوں کے متعلق بھی تھوڑی بہت خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

”کینوس کے رنگ“ اس توقع کے ساتھ اہل نظر کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اسے فراخدلی کے ساتھ قبول کریں گے اور دوسروں کو بھی اس سے متعارف کرانے کی زحمت فرمائیں گے۔

اردو سماج،
۷۵۔ ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

سلمان عباسی

روح جگر کہنا بڑی تک صحیح ہے۔

تقریباً نصف صدی تک ان کی فکر جمیل اردو دنیا کو اپنا گرویدہ بناتی رہی۔ یہ مقبولیت، یہ خوش نصیبی بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔

جگر کا تغزل اور آہنگ دلوں کو موہ لیتا ہے، ان کے پیغام محبت نے ہر دل کو متاثر اور مسحور کیا۔

انڈور کے مشہور آرٹسٹ شری ایس کے ماتھر جگر مرادآبادی کی مشہور غزل سنا رہے ہیں:۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا
جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ ری معراج شوق
دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسنِ تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا
دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار
بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

برج نرائن چکبست

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کی زندگی آغاز اور اختتام اسی ایک فلسفہ پر مشتمل ہے۔ انھوں نے زندگی اور موت کا جو گہرا مطالعہ اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے وہ کم حیثیت کا نہیں ہے۔ زندگی کی ان گہرائیوں اور گہرائیوں کا تجزیہ کرنے والے بیسویں صدی کے صرف دو شاعر ہیں۔ ڈاکٹر اقبال اور چکبست۔ لیکن قومی شاعری کی آخری منزلوں پر صرف چکبست کا نام باقی بچتا ہے ان کے دل میں قوم کے ساتھ ساتھ وطن میں رہنے والے ہر فرد سے محبت اور شفقت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غلامی کے دور میں پروان چڑھنے والے شاعر کے دل میں آزادی کی اُمنگیں موجزن ہیں۔ زنجیر و سلاسل، قید و بند اور دار و رسن کے سائے میں ان کی دیوی آزادی کے ترانے سنا رہی ہے اور شاعر کے دل میں جذبۂ آزادی کی لگن کو اور بڑھاوا دینے کے لئے ہمہ تن مصروف ہے۔ یہ لگن ایسی ہے جو کسی مشکل کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ کسی قسم کے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے حق میں نہیں اور کسی بھی ایثار اور قربانی کے وقت کسی سے پیچھے نہیں ہے

نے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے

جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنڈت برج نرائن چکبست ایک مغرز کشمیری برہمن گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے آباؤ اجداد کا وطن لکھنؤ ہے لیکن وہ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چکبست اوائل عمری ہی میں لکھنؤ آ گئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ۱۹۰۹ء میں یہیں سے باقاعدہ وکالت شروع کر دی۔ وکالت میں ان کو بہت کم وقفہ میں شہرت حاصل ہو گئی اور جلد ہی لکھنؤ کے اچھے وکلا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کے سلسلے میں رائے بریلی گئے۔ واپس ہونے کے لئے ٹرین میں بیٹھے۔ فالج کا شدید دورہ پڑا اور اسٹیشن پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

کاظم حسین صاحب محشر نے انھیں کے مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ؎

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا ۱۳۴۴ھ
موت کیا ہے اجزا کا پریشاں ہونا ۱۹۲۶ء

چکبست کی ابتدائی شاعری کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے پہلی غزل فقط نو برس کی عمر میں کہی تھی اور جب سے یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ اساتذہ میں غالب، آتش، انیس سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی غزلیات سے آتش اور مسدس سے انیس کا رنگ جھلکتا ہے۔ انداز فکر الگ الگ ہیں لیکن سلاست، بندش الفاظ، حسن ترکیب اور روانی میں انھیں استادوں

سے فیض اٹھایا۔ چکبست نے جدید خیالات کو نظم کیا ہے۔ مگر زبان کی لطافت، شیرینی، پختہ کاری، اور پاکیزگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے ہم وفا کرتے رہے
اہل ہمت منزل مقصود تک آ ہی گئے
بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی ہم انتہا کو بھول گئے
جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں جو دریا کو بلا دیتے ہیں

ان کی شاعری میں قدیم اور جدید رجحانات کی یکساں نمایندگی ہے۔ قدامت اور جدت کے اس حسن امتزاج سے انھوں نے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس دور کی غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے والوں میں چکبست کا نام نمایاں طور پر سرفہرست ہے جب کہ اردو شاعری "درباری شاعری" کے حصار میں قید ہو چکی تھی۔ اردو غزل دوسری اصناف سخن پر امراء اور رؤساء کی توصیف و مدح کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ خصوصاً غزل تو صرف ایک روایتی صنف سخن بن کر رہ گئی تھی۔ فارسی غزل کے اثر سے اردو غزل محدود اور تنگ دست ہو گئی۔ غزل پر آورد اور تصنع نے پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اس دور کے شعراء نے ایسے محاورے، تشبیہہ اور استعارے استعمال کرنا شروع کر دئے جن کا حقیقت میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اکثر شعراء یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ بندشیں اور قیود ان کا گلا گھونٹ دیں گے لیکن وہ روایات کی پیروی کرنے پر مجبور سے تھے۔ شاید ماحول کی

اسی گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لئے

پنڈت برج نرائن چکبست کا مزاج خالص لکھنوی ہے۔ وہ لکھنؤ کے ادبی ماحول میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے، انھوں نے شاعری میں بھی لکھنوی رنگ سخن اختیار کیا۔ ان کے طرزِ بیان پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر لگی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی جذبات طرازی، ندرتِ فکر اور پیش گوئی کی وجہ سے انھیں جدید شاعر ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ جدید ہندوستان کے معماروں میں ان کا کلام یقیناً جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ انھوں نے جس حسن کے ساتھ روایت شکنی کی ہے اس کی مثالیں ان کے کلام میں جا بجا ملیں گی۔ کنگھی، چوٹی، زلف و آئینہ وادا اور دوسری عشقیہ علامات کو بالائے طاق رکھ کر انھوں نے زنجیر و سلاسل، قید و بند اور دار و رسن کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ انسانی زندگی کے تاریک و مکدر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے امکانی کوششیں کیں اور آزاد فضا میں سانس لینے کی قسم کھائی ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
چراغ قوم کا روشن ہے عرشِ پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے
مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے
باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

برج نرائن چکبست کے تقریباً سبھی ہم عصر اُن کی شاعری اور کمال کے قائل ہیں گو کہ زمانے کے ساتھ ساتھ مذاقِ سخن بھی بدل دیا جاتا ہے۔ ایک دور کی رائے دوسرے دور سے مختلف ہوتی ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کسی بڑے نقاد کا کام نہیں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا شاعری مصنوعی قید سے آزاد ہوتی جائے گی اور آزادی کی فضا میں اس کو نشو و نما کا موقع ملے گا، برج نرائن چکبست کی شہرت بتدریج بڑھتی جائے گی۔ آنے والی نسلیں اس حقیقت کو تسلیم کریں گی کہ وہ جدید دور کے رہنماؤں میں سے ہیں اور انھوں نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

یگانہ اور ترانہ

مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی ۔ بیسویں صدی کے چند ممتاز لیکن بدنام شاعروں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ممتاز اس لئے کہ انھیں قدرت کی طرف سے قادرالکلامی عطا ہوئی تھی ۔ اور بدنام یوں کہ انھوں نے قرآن، رسولؐ، حدیث اور اردو کے مشہور شاعروں غالبؔ اقبالؔ عزیزؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، پیارے صاحب رشیدؔ اور دیگر شعراء پر تنقیص و تعریض کی بوچھار کرتے وقت حد ادب کو ملحوظ نہ رکھا ۔ نتیجتاً پہلے بدنام ہوئے پھر اسی سرزمین لکھنؤ پر ذلیل و رسوا کئے گئے ۔ محفلوں میں برسرِعام ٹوکے جانے کے بعد جوتوں کا ہار گلے میں ڈال کر گدھے پر بٹھا کر لکھنؤ کے ایک گروہ نے شہر کی خاص خاص سڑکوں پر ان کا جلوس نکالا ۔

یہ سب کچھ ہونے کے بعد جب ایسی نازیبا حرکت کرنے والوں کو حراست میں لیا گیا اور یگانہؔ سے اپنا بیان لکھوانے کو کہا گیا تو انھوں نے بڑے وثوق سے کہا "میں شان پیمبرانہ رکھتا ہوں اور سارے خطا کاروں کو معاف کرتا ہوں"

اسی "شان پیمبرانہ" رکھنے والے شاعر کی رباعیوں کا مجموعہ "ترانہ" میرے پیش نظر ہے ۔ جس کا مختصر انتخاب پیش خدمت ہے ۔ انتخاب کرتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ کہیں بھی کوئی ایسا موضوع نہ آجائے جہاں اختلاف یا تمدد کی کوئی صورت پیدا ہو ۔ خلط مبحث اور مذہبی نظریات کے سلسلے میں ان کے کلام کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے

دوسو سولہ ۲۱۶ صفحات کے بیس تیس ایک سولہ ۱×۱۶ سائز پر مشتمل رباعیوں

کے زیر نظر مجموعے کی جلد نیم چرمی ہے جس پر سنہری الفاظ میں ڈائی (Dye) سے کتاب کا عنوان "ترانہ" اور خوبصورت گل بوٹے ثبت ہیں۔ یگانہ کا نام بھی بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ اندرونی پہلے صفحہ پر درج ہے۔

ترانہ

یعنی

مرزا یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی کی رباعیات کا مجموعہ

ناشر

ہندوستان بھر کے علمی و ادبی اداروں کے

واحد نمائندے

اردو بک اسٹال۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

سمتر ۱۹۳۲ء قیمت:۔ اعداد مسخ شدہ

غالباً یگانہ کی رباعیوں کے مجموعے کا یہ پہلا اور آخری ایڈیشن ہے جس کے پہلے اندرونی صفحے کے بعد شاعر مذکور کی ایک پرشکوہ تصویر شائع کی گئی ہے۔ تصویر کے نیچے ذیل کی تحریر اردو اور انگریزی میں موجود ہے۔

زیر نظر مجموعے میں از اول تا آخر مرزا یاس یگانہ کی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات و مشاہدات نیز ایسے نشیب و فراز کی تصویر کشی اس فنی چابکدستی کے ساتھ کی گئی ہے کہ ایک ایک مصرعہ اپنی جگہ بجائے خود ایک تخلیق کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ہر رباعی کے چار مصرعے کچھ ایسی مہارت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ چسپاں کئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے سے باہم مربوط و منسلک نظر آتے ہیں۔

پرتو

نام ــ محمد سلمان عباسی
تخلص ــ سلمان
موجودہ پتہ ــ ۵ ۷ ـ ڈاکٹر موتی لعل بوس روڈ لکھنؤ ـ ۲۲۶۰۰۱
شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

تعلیم ــ ڈی۔ لٹ اسکالر (فارسی)، پی ایچ۔ ڈی (فارسی)، ایم۔ اے (فارسی)، ایم۔ اے (اردو)
پروفیشنسی ان عربک، دبیر کامل، دبیر ماہر (فارسی)، ادیب کامل، ادیب ماہر
ادیب (جامعہ اردو علی گڑھ)

تصانیف ــ یادگار آزادی (تالیف ۱۹۶۹ء) شش جہت (شعری انتخاب ۱۹۷۱ء) یادوں کے
گلاب (نظموں کا مجموعہ ۱۹۷۳ء) بدیسی کہانیاں (تراجم ۱۹۷۶ء) نجموں کا سفر (سفرنامۂ
ایران ۱۹۷۷ء) غزالی مشہدی، حیات اور کارنامے (مقالہ برائے ڈاکٹوریٹ ۱۹۷۸ء
دس بجے رات کے بعد (طویل نظم ۱۹۷۹ء) نوشتے (شعری مجموعہ ۱۹۸۶ء) کینوس کے
رنگ (مجموعۂ مضامین ۱۹۸۹ء) مضامین، تبصرے، تقاریر، ڈرامے، مقالے وغیرہ
(تقریباً ایک سو پچاس)

اعزازات ــ ریسرچ سائنٹسٹ، ریسرچ ایسوسی ایٹ، سینیر ریسرچ فیلو، جونیر ریسرچ فیلو،
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (نئی دہلی) چار تصانیف اتر پردیش اردو اکاڈمی سے اور ایک بنگال
اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ، آل انڈیا میر اکاڈمی سے "امتیاز میر" ایوارڈ، سرکاری
دعوت پر سفر ایران وغیرہ وغیرہ۔

مشاغل ــ ادبی، ثقافتی اور سماجی ادارہ "اردو سماج" کے پروگراموں اور اس کے اشاعتی کام
سے دلچسپی، تصنیف و تالیف اور ع ـ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

(THE ARCH ARTIST POET OF INDIA)

(ہندوستان کے فنکار شاعروں کا روشن منارہ)

صفحہ اول سے چار تک مقدمہ کی صورت میں حسب ذیل تحریر خاص طور پر غور طلب ہے جو "مغالطہ" عنوان کے تحت خود یگانہ چنگیزی نے سپرد قلم کی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے پورا مقدمہ ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔

"مغالطہ"

"میرے نظریہ زندگی کی نسبت عام طور پر لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کے تلخ تجربات نے میرے نظریہ حیات میں (خدانخواستہ) ایسی افسردگی پیدا کردی ہے جس سے میری طبیعت ہر وقت مکدر رہتی ہے۔ مگر یہ قیاس حقیقت حال سے بعید ہے پست ہمتوں کا ذکر نہیں۔ مردوں کے لئے تو زندگی کے تلخ تجربے کڑوی دوا کا حکم رکھتے ہیں۔ جو اصلاح مزاج کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ طبیعت کا مکدر رہنا اور نظریہ حیات میں افسردگی پیدا کرنا تو کجا۔ ایسی تلخی (بشرطیکہ تہذیب نفس) کا آلہ بن کر انسان کو سچی مسرتوں سے شادکام بناتی ہے۔

مسرتیں بھی وہ جو نجاستوں سے پاک وصاف ہوتی ہیں۔ مگر پاک وناپاک مسرتوں میں فرق کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

قدرت کے خزانے سے جسے ایسی پاک وپاکیزہ مسرت نصیب ہو وہ زندگی سے بیزار کیوں ہونے لگا۔ اس کے نظریہ حیات پر افسردگی کیوں چھانے لگی؟

زندگی کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونا اور بات ہے اور زندگی سے بیزار ہو جانا اور بات ہے۔ میں کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا۔ ہاں دل جب تک زندہ ہے زمانے کے سرد گرم سے متاثر ہونا اک قدرتی امر ہے مگر اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ تلخ تجربات سے نظریہ حیات میں بھی تلخی پیدا ہو جائے اور انسان زندگی جیسی نعمت سے آزردہ ہو جائے۔ دل ایک ترازو ہے جس کے پلّے ہوا کے جھونکوں سے اُن کے آن اِدھر اُدھر جھک تو جاتے ہیں۔ مگر پھر تھوڑی دیر میں توازن برابر ہو جاتا ہے۔

صدق وصفا، مہر و وفا کی دیوی (ریگانہ بیگم) کو خداوند عالم نے جس کا رفیق زندگی بنا کر حقیقی مسرتوں سے بہرہ ور فرمایا۔ اس کی روحانی زندگی، مادی کشمکش کے ہاتھوں تلخ کیوں ہونے لگی؟۔ یہ صحیح ہے کہ مادی کشمکش نے مجھے آزمائشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میری محترم شریک زندگی کی والہانہ محبت اور وفادارانہ دلجوئی نے میرے دماغی توازن کو اتنا سنبھالے رکھا کہ میں سخت سے سخت امتحان میں کامیاب رہا۔ بیگم کے دم سے جو سچی روحانی مسرت مجھ ایسے بے نوا کو حاصل ہے وہ شاہوں کو تو کیا دنیا کے معدودے چند خوش نصیبوں کو ہی مل سکتی ہے۔

زندگی کی کامیابی اور ناکامی محض اعتباری حیثیت رکھتی ہے لوگ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مجھے ناکام یا ناشاد جو چاہیں سمجھ لیں۔ مگر میں اس حقیقی مسرت اس آسودہ ضمیر کی روشنی میں اپنے تئیں کیوں ایسا سمجھ لوں۔ حق تو یہ ہے

کہ کامیابی کا کوئی واحد معیار قائم نہیں کیا جا سکتا جو سب کے نزدیک مسلّم ہو۔ اپنے اپنے مذاق اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق ہر شخص کامیابی یا ناکامی کا معیار قائم کر لیتا ہے۔ کوئی مدبّرانہ اور عیارانہ زندگی کو کامیاب سمجھتا ہے۔ کوئی شاہانہ زندگی کو، کوئی مجاہدانہ اور فاتحانہ زندگی کو مایۂ ناز جانتا ہے، کوئی پیمبرانہ و مصلحانہ زندگی کو، کوئی شاعرانہ و فلسفیانہ زندگی کو وغیرہ وغیرہ۔ اس اختلاف مذاق پر نظر رکھ کر اس شخص پر غور کرو۔ جس نے کبھی مسہری یا چھپر کھٹ کا منہ نہ دیکھا بلکہ کھرّے پلنگ یا بورئے پر پاک و پاکیزہ محبت کی فضا میں زندگی بسر کر دی اور حسب توفیق ایزدی اپنے آرٹ کے ذریعہ پیام وجدانی پہنچا کر فرائض انسانی بجالایا اور اس طرح سکون قلب کی دولت حاصل کی۔ (اگرچہ جسمانی آرام و آسائش سے بے بہرہ رہا) تو پھر اس کی زندگی ناکام کیوں کر کہی جا سکتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور اس کا نظریہ حیات تلخ و ناگوار کیوں ہوگا؟

اہل نظر کے دل و دماغ پر جس نے اپنے آرٹ کا سکّہ بٹھا دیا۔ حاسدانہ شورشوں کے ہجوم میں جس نے اپنا لوہا منوا لیا۔ اپنے کیریکٹر نیز اپنے حریفوں کے کیریکٹر کا امتحان لے کر جو اپنی آن بان پر قائم رہا۔ اپنے طرز زندگی اور اپنے ترانۂ وجدانی سے برادران وطن خصوصاً طبقۂ شعراء کو غلامانہ ذہنیت سے آزادی کا سبق دے کر بہتیروں کو اپنی زندگی میں زنجیر تقلید سے آزاد ہوتے دیکھ لیا۔ دوستوں کا کیا ذکر جس نے دشمنوں کے دلوں کو بھی اپنی یاد سے خالی نہیں چھوڑا تو چشم تحقیق ایسی زندگی کو ناکام کیوں کر کہہ سکتی ہے۔ کامیاب زندگی تو وہی ہے کہ دنیا سے اٹھ جانے پر بھی جس کی یاد دوست و دشمن کے دلوں کو گرماتی رہے ؎

حیران ہے کیوں راز بقا مجھ سے پوچھ
میں زندۂ جاوید ہوں آ مجھ سے پوچھ

مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے
جینا ہے تو موت کی دوا مجھ سے پوچھ

صفحہ پانچ پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے طغرے کے بعد پہلی رباعی "ترانۂ نیم شبی" کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

ساجن کو سکھی بنالو پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا
سوتا سنسار ، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنا لو پھر سو لینا

مذکورہ بالا رباعی سمیت "ترانہ" میں کل دو سو پانچ (۲۰۵) رباعیاں شامل ہیں جن کا سرسری انتخاب ذیل کی سطروں میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ اور انتخاب کرتے وقت یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ کہیں پہ بھی یگانہ یا انتخاب کرنے والے کو کسی تعصب و تفریق میں ملوث نہ کیا جا سکے ۔" ترانہ کی رباعیوں کا مختصر انتخاب پیش خدمت ہے ۔

مہمان ہے تو صاحبِ خانہ ہوں میں
آئینۂ حسنِ جاودانہ ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے یگانہ ہوں میں

اقلیمِ سخن نام مرا جپتا ہے
کیوں لکھنؤ اپنے بھار میں تپتا ہے
تصویرِ یگانہ آپ بول اٹھے گی
ہاں ایسے ہی منہ پہ بانکپن کھپتا ہے!

چارہ نہیں کوئی جیتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے
جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

دل ہو زندہ تو بارِ خاطر کیوں ہو
دردِ غم ناگوار خاطر کیوں ہو
باقی ہو دماغ میں اگر بُوئے اُمید
پیراہنِ جاں غبار خاطر کیوں ہو

دُنیا کے مزے میں ڈوب کر کیا تر تے
آنکھیں رکھتے تو کیوں گڑھے میں گرتے
لو دیکھ لو اب عیش پرستوں کی دُسا
مُردے دیکھے نہ ہوں گے چلتے پھرتے

ہے اور بھی اک راہ مذہب کے سوا
منطق کے سوا، علم مذبذب کے سوا
باز آ گئے منزل سے۔ کہاں کی منزل؟
مطلب نہیں کوئی ترکِ مطلب کے سوا

مطلوب ہے خواجہ کوئی احساں تازہ
اس دردِ طلب کا کوئی درماں تازہ
کلمہ سے غرض ہے نہ کبھجن سے مطلب
اک نعرۂ ہُو سے کر دے ایماں تازہ

زنجیر سے ہونے کا نہیں دل بھاری
ہوں پاؤں میں کتنے ہی سلاسل بھاری
کعبہ کا سفر ہی کیا ہے؟ گھر سے در تک
دل سے دل تک مگر ہے منزل بھاری

ہاں اے دل اپنا طلب آرام نہ لے
بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی
ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

یاد آ گئی آوازِ دلِ گم گشتہ
ملنے لگا پھر سازِ دلِ گم گشتہ
پہنچا ہے کہاں خاک کا پتلا اڑ کر
اللہ ری پروازِ دلِ گم گشتہ

دل میں آ بیٹھ درد پہلو ہو کر
پھر اپنے تئیں دکھا دوں میں تو ہو کر
آئینہ میں کیا دیکھتا ہے رنگ اپنا
مجھ میں تو سما دیکھ ذرا بو ہو کر

رونا ہے بڑا جنھیں وہ جم جم روئیں
جب عیش مہیا ہو تو ہم کیوں کھوئیں
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
رات اپنی ہے پھر کیوں نہ مزے سے سوئیں

کعبہ کی طرف دُور سے سجدہ کر لوں
یا دَیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
اک اور گناہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

پیری کی ہوس ہزار منتر پڑھتی
گھٹنے کے سوا عمرِ رواں کیا بڑھتی
جھونکے میں فنا کے کیا پنپتا کوئی
سر جھکائی ہوئی بیل منڈھے کیا چڑھتی

دیکھے ہیں بہت چمن اُجڑتے بستے
کیا کیا گلِ پیرہن سلے ہیں سستے
اے زندہ دلانِ باغ اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
ہاں چاند کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
اے حُسن دو روزہ پہ اکڑنے والو
یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دُنیا
گستی ہے کبھی جھنجھوڑتی ہے دُنیا
پائے ہمت کو توڑتی ہے دُنیا
نمرود بنا کے چھوڑتی ہے دُنیا

دنیا نے جسے اپنے شکنجے میں کسا
چھوٹا نہ کبھی موت کے پنجے میں پھنسا
پانی بھی نہیں مانگتا اس کا مارا
سوتا ہے پڑا جیسے ناگن کا ڈسا

شاہوں کو ننگا ہوں سے گرا کر مارا
شہزادوں کو در بدر پھرا کر مارا
دنیا سے پلٹنے والے بے موت مرے
ایک ایک کو کیا دھرا دھرا کر مارا

مردوں کو کشاں کشاں لئے پھرتی ہے
پھرتے ہیں جہاں جہاں لئے پھرتی ہے
منہ موڑ کے لکھنؤ سے پہونچے ہیں دکن
تقدیر کہاں کہاں لئے پھرتی ہے

اے لکھنؤ! اے دیارِ دور افتادہ
اے جانِ من اے بہارِ دور افتادہ
اب دور سے اس خاک کو سجدہ کر لے
میں کون ہوں؟ اک مزارِ دور افتادہ

امکانِ طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا تہہ دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے؟
مل جائے گی راہِ راست گمراہ تو ہو

منزل کا پتہ ہے نہ ٹھکانا معلوم
جب تک نہ ہو گم، راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا ہے انساں تو کچھ پاتا ہے
کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

دیوانہ کیوں تیری نظر پر نہ چڑھے
پروانہ وہ کیا جو شمع کے سر نہ چڑھے
کس کام کا وہ خار جو دل میں نہ گڑے
وہ پھول ہی کیا ہے جو ہمیر نہ چڑھے

بوسہ نہیں بوسے کا مزا لیتا ہوں
جھوٹی سچی ہوس بجھا لیتا ہوں
چلتا نہیں زور ان سے لپٹئے کیوں کر
منہ دیکھ کے بس ہونٹ چبا لیتا ہوں

اللہ ری تصویر کی یہ رنگین نظری
غربت میں بھی دِل جلوں کی کھیتی ہے ہری
کروٹ کروٹ ہے لہلہاتی جنت
جب تک ہے ہوائے لکھنؤ سر میں بھری

گزری ہے بہارِ عمر تنکے چنتے
آتش کدۂ شوق میں جلتے بھنتے
یارانِ چمن گاتے ہیں اپنی اپنی
میری سنتے تو دیر تک سر دھنتے

یارانِ چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے
تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن
دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

جب عالمِ ایجاد نے صورت پکڑی
مجموعۂ اضداد نے صورت پکڑی
آباد ہوئی دل میں انوکھی دنیا
کیا دردِ خداداد نے صورت پکڑی

بیدرد دوا مانگنے والا تو کون ؟
کیوں میرے سوا مانگنے والا تو کون ؟
ہنستا ہوں خود اپنے حال پر، میرے لئے
رو رو کے دُعا مانگنے والا تو کون ؟

کافر کا مسلمان سے بس کیا چلتا
دیوؤں کا سلیمان سے بس کیا چلتا
لاکھوں شیطان پر ایک انسان بھاری
شیطان کا انسان سے بس کیا چلتا

نخاس سے خلعت کوئی منگوا لیتا
یا چوک سے جوڑا کوئی سنگوا لیتا
حجلہ میں ڈٹا ہے شیخ کفنایا ہوا
داڑھی کی طرح کفن بھی رنگوا لیتا

ابجد

(پہلا حصّہ)

۱۔ قومی یکجہتی اور کلام خسرو ۱۳

۲۔ غزالی مشہدی ۲۷

۳۔ میر تقی میر ۳۵

۴۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے ۳۹

۵۔ موازنہ — دبیر اور شبلی ۵۱

۶۔ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو ۶۳

۷۔ برج نرائن چکبست ۷۵

۸۔ یگانہ اور ترانہ ۸۱

۹۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۹۵

۱۰۔ ایک ادبی درکشاپ ۱۰۵

عاشق ہوں تیرا۔ کالا کلوٹا ہی سہی
سچّا نہ سہی بلا سے جھوٹا ہی سہی
صد پارۂ دل میں ہیں یہ جلوے کس کے؟
آئینہ پھر آئینہ ہے ٹوٹا ہی سہی

منبر پہ جناب جب کبھی ریز کریں
جو بات کریں مضحکہ انگیز کریں
انگور حلال اور مئے انگور حرام
گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں

وہ دور نہ رہا نہ وہ زمانہ باقی
ہے اور کوئی دن یہ فسانہ باقی
کیسا ادبار اور کہاں کا اقبال
دُنیا فانی مگر یگانہ باقی

بادل کو لگی کھلتے برستے کچھ دیر
دل کو نہ لگی اُجڑتے بستے کچھ دیر
بچوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا
روتے کچھ دیر ہے نہ ہنستے کچھ دیر

مسعود حسن رضوی ادیب

ایسے بھی کچھ اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
ہم ڈھونڈھنے نکلیں گے مگر پا نہ سکیں گے

راجہ دین دیال روڈ پر بنی ہوئی عمارت "ادبستان"، لکھنؤ کی چند ایسی خاص عمارتوں میں شامل ہے جو ہمیشہ اپنے مکین کی مرکز نگاہ رہی ہے اور جس پر اس کے مالک نے اپنی زندگی بھر، بھرپور توجہ بھی کی ہے۔ اس عمارت نے زمانے کے سرد گرم جس خوبی کے ساتھ جھیلے اور جتنی سرسبز و شاداب زندگی گزاری اس کے لئے اس کی قسمت پر فخر کرنا چاہئے۔" ادبستان "کو بیسویں صدی کے تین چوتھائی حصہ میں اردو ادب کے چاند اور ستاروں کی زیارت کرنے کا شرف حاصل ہے۔ علامہ بیخود موہانی، مولانا صفی لکھنوی، انور حسین آرزو، یگانہ چنگیزی، مرزا ہادی رسوا، مرزا محمد عسکری، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، علی عباس حسینی، اختر علی تلہری، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور اور نہ جانے کون کون ہے اس کی گہما گہمی میں شریک رہ چکے ہیں ـــ اس عالیشان کوٹھی کے مکین جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔ ادیب۔ عجیب گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ تنقید، تحقیق، تالیف، ترتیب وغیرہ میں یگانہ روزگار۔ اور۔ شاعری کے واقف کار۔ حالانکہ ادیب ان کا شاعرانہ تخلص نہ تھا لیکن بہرحال وہ واردات قلبی سے متاثر ہوکر کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں خود کہتے ہیں ـــ "شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں رہا۔

تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خود رو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تاثرات کا پرتو ہیں۔ اس لئے وہ اچھے ہوں یا بُرے بہرحال سچی شاعری کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔"

میانہ قد، چھریرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی اور گہری آنکھیں، ہستوان ناک، چہرے پر گھنی سفید مونچھیں اور آنکھوں پر سفید شیشے کا چشمہ۔ شیروانی۔ علی گڑھ پاجامہ، ٹوپی اور جوتوں کو استعمال کرنے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھے۔ ہاتھوں میں چھڑی اور جیب میں گھڑی رکھنے سے اگر کسی شخصیت کی وجاہت میں اضافہ ہو جاتا تھا تو وہ شخصیت مسعود صاحب کی تھی۔

لیکن ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو ادبستان کو اپنے مثالی اور عالیشان مکین کی رفاقت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ ایک طرف پسماندگان کی غضبناک خاموشی دوسری طرف اعزاء اقرباء، احباب، ملنے جلنے والوں، ہمدردوں اور معتقدین کے اُڑے اُڑے چہرے زبان بے زبانی سے ایسی کربناک داستان دہرا رہے تھے جسے سن کر کلیجہ پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔

مسعود صاحب اس دارفانی سے کوچ کر گئے تھے لیکن ان کا دل ہر سوگوار کی آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ سوگواروں کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو اس راز کو افشاں کرنے کے لئے کافی تھے۔

یقین نہیں آتا کہ اس سانحے کو گزرے ہوئے چار سال کا وقفہ ہو گیا ہے۔ یہ تو ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے جب اہل لکھنؤ اودھ کی روایتی وضعداری کا جنازہ اپنے کاندھوں پر لادکر لے گئے تھے اور اسے فضل علی کی کربلا میں نہایت بیدردی کے ساتھ سپرد خاک کر کے چند روز کے لئے کف افسوس ملتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔

سنہ ۱۹۷۹ء

مشہور عالم دین اور مجتہد مولانا سید علی نقی صاحب نے پچاس ساٹھ سال کی دیرینہ رفاقت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مسعود صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی، اور مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی نے دوبارہ نماز جنازہ پڑھا کر علمائے فرنگی محل سے مسعود صاحب کی دیرینہ قربت کے واقعات پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

پورے چار سال سے پروفیسر مسعود حسن رضوی اس خطۂ ارضی پر اطمینان سے محو خواب ہیں۔ اب نہ وہ سرگرمیاں ہیں، نہ کام کا بوجھ اور نہ ان کے کام میں خلل ڈالنے والے لوگ۔ لیکن ان کی طویل غیر حاضری سے "ادبستان" کے چہرے پر پراگندگی کے آثار کافی نمایاں ہو گئے ہیں اور وہ ہر قت باہیں پھیلائے اپنے بچھڑے ہوئے مکین کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اب اس کی تنہائی پر ہر واقف کار کو تاسف ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟

مسعود صاحب کی ابتدائی زندگی کے متعلق ایسی خود نوشت تحریریں موجود ہیں جن کی مدد سے ماضی کے دریچوں کو کھول کر ان کی ہشت پہل شخصیت کا واضح خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

ان کے والد سید مرتضیٰ حسین صاحب ایک ذی علم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ ضلع اناؤ کا قصبہ نیوتنی ان کا آبائی وطن تھا مگر حصول علم کا شوق انھیں لکھنؤ لے گیا۔ اور آب و دانے کی کشش نے بہرائچ پہونچا دیا۔ سید مسعود حسن رضوی انھیں بزرگ کے چشم و چراغ تھے اور ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو عالم وجود میں تشریف لائے۔

چار سال کی عمر میں مسعود صاحب کی بسم اللہ ہوئی اور عربی، فارسی کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ حالانکہ والد صاحب انھیں طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم بنانا چاہتے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد تعلیم کا رخ بدل گیا اور انگریزی تعلیم شروع ہوئی۔ والدۂ محترمہ کی ہمت مردانہ نے ان کی

ان کی ایسی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہر امتحان میں نمایاں کامیابی اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے رہے۔

ابھی ہائی اسکول بھی مکمل نہ کرپائے تھے کہ "دردسر" جیسے موذی مرض نے مستقل اسیر بنالیا۔ اور۔ مرتے دم تک اس نے مسعود صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ ہمیشہ دردسر کی کمی و بیشی میں مبتلا رہتے۔ لیکن ذوق تعلیم نے ہمت نہ ہاری اور انھوں نے ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے انگریزی ادبیات میں داخلہ لیا۔ مگر امتحان میں بوجہ علالت شریک نہ ہوسکے اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اپریل ۱۹۱۸ء میں صوبہ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں Reviewer کی جگہ پر ان کا تقرر ہوگیا۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں چھپیں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ تیار کرکے معہ تبصرے کے سررشتہ تعلیم کے ڈائریکٹر کو ہر سال روانہ کی جائے اور رائے عامہ معلوم کرکے اس کی رپورٹ یو۔ پی گورنمنٹ گزٹ میں شائع کرنے کے لئے بھیجی جائے۔ اس زمانے میں صوبہ بھر میں تقریباً تین ہزار کتابیں ہر سال شائع ہوتی تھیں۔ اس عہدے پر مسعود صاحب نے تقریباً ساڑھے تین سال تک اپنے فرائض منصبی انجام دئے۔ اور۔ اس طرح دس ہزار سے زاید چھوٹی بڑی اور مختلف علوم وفنون سے متعلق کتابوں کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا۔

یوں تو وہ آٹھ سال کی عمر سے لکھنے پڑھنے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے لیکن اس ملازمت نے ان کے ذوق مطالعہ کو بڑی تقویت بخشی اور انھوں نے پڑھنے لکھنے کو اوڑھنے بچھونے کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ اب وہ تھے اور بے شمار کتابوں کا انبار۔ مطالعہ کا ذوق اور لکھنے پڑھنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ مسعود صاحب نے مذکورہ ملازمت سے طویل رخصت لے کر ٹیچرس ٹریننگ کالج الٰہ آباد

میں تربیت حاصل کر کے ایل۔ ٹی کی سند حاصل کر لی۔

اسی سال جولائی کے مہینے میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں تقرر ہو گیا۔ اس ملازمت کی عمر صرف چالیس دن ہوئی تھی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جونیئر لکچرر کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ تمام سرکاری نعمتوں اور منصبی ترقیوں کے امکان کے باوجود مسعود صاحب نے سرکاری ملازمت سے بخوشی استعفا دے کر یونیورسٹی کی ملازمت قبول کر لی۔

۲۵-۱۹۲۴ء میں فارسی کے سینئر لکچرر کی قائم مقامی کی۔ اسی سال ایم۔ اے فارسی کا امتحان بھی اول درجہ میں اس امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا کہ گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ جب فارسی کی جگہ پر مستقل کا مسئلہ پیش ہوا تو خود درخواست دے کر اردو کے جونیئر لکچرر کی حیثیت سے اپنی پرانی جگہ پر واپس آ گئے۔ اس لئے کہ دل میں تو اردو کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ اس جذبہ کے تحت انھوں نے یہ بڑا مالی نقصان برداشت کر لیا۔

اگست ۱۹۲۷ء میں اردو کے لکچرر کی ایک نئی جگہ نکلی اور اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اس تقرری کے تین سال بعد اگست ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے ریڈر اور شعبہ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہو گئی ۔۔ اور ۔ اس جگہ پر مسعود صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

مئی ۱۹۵۳ء میں فارسی و اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ الغرض تیس برس (۳۲) کی خدمت کے دوران چوبیس (۲۴) برس شعبہ فارسی و اردو کی خدمت کر کے جون ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

اردو تنقید کی تاریخ میں ان کا سب سے اہم کارنامہ "ہماری شاعری" ہے۔ حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد اردو دنیا

میں کچھ اہم اور ضروری سوالات پیدا ہو گئے تھے جن کے جوابات عنقا تھے جس کی وجہ سے فن تنقید میں بہت بڑی کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن مسعود صاحب نے "ہماری شاعری" تصنیف کر کے "مقدمہ شعر و شاعری" کی وجہ سے پیدا ہونے والے عدم توازن کو ختم کر دیا۔

"ہماری شاعری" کے علاوہ آپ کے متعدد کارنامے ہیں۔ یوں تو آپ نے اپنی ساری عمر تعلّم و تعلیم، درس و تدریس اور لکھنے پڑھنے میں گزار دی اور بے انتہا تنقیدی و تحقیقی شہ پاروں اور شاہکاروں کے خالق قرار پائے۔ لیکن روح انیس، شاہکار انیس، دیوان فائز، ذکر میر، اندر سبھا، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، فیض میر، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، فرہنگ امثال، امتحان وفا، مجالس رنگین، دبستان اردو، نظام اردو، جواہر سخن، متفرقات غالب، اردو زبان اور اس کا رسم خط، جذبات بھاکا، آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، اور فنیسیات وغیرہ کو دیکھ کر ان کی ادبی کد و کاوش اور بے پناہ محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ادب کے معاملے میں ہمیشہ بڑے دیانتدار اور پر خلوص اسکالر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد صرف سینتس (۳۷) ہے لیکن ان کا وزن، وقار اور درجہ زیادہ ہے۔ خود مسعود صاحب پر جو مقالے اور مضامین لکھے گئے، جو تصنیفات منظر عام پر آئیں یا جن خاص نمبروں کا اجرا ہوا ان کی تعداد علیحدہ ہے۔

مسعود صاحب کے مضامین میں زبان کی سادگی اور گہری تحقیق کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں اکثر خشک اور ادق موضوعات بھی آجاتے ہیں لیکن ان کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ باریک سے باریک نکتہ کو بھی واضح کئے بغیر نہیں چھوڑتے، ایسے اوقات میں ان کی سادہ اور چست زبان سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

تنقید کے میدان میں آپ قدیم مکتبہ فکر کے نمائندہ تھے، لکھنؤ کی روایتی

تہذیب کے علمبردار اور گہوارۂ تمدن کی آخری چند یادگاروں میں ایک ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قدماء کے جلائے ہوئے چراغوں کی لَو میں اضافہ کرنا چاہتے تھے ۔ انھیں جدیدیت سے کوئی اختلاف ہرگز نہ تھا ۔ وہ دوسرے قدیم طرز کے قلمکاروں کی طرح نئے لکھنے والوں پر تنقیدیں کرنے کے بجائے خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے اور لکھنؤ کی قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے ادب میں بھی قدیم نقطۂ نظر کے قائل تھے ۔

بیاسی (۸۲) برس کی عمر ہو جانے کے باوجود وہ ہشاش و بشاش اور خوش و خرم نظر آتے رہے ۔ لکھنے پڑھنے کا کام وہ اس عمر میں بھی اتنا کرتے تھے کہ کم عمر والوں کی بھی ہمت پست ہو جائے ۔ اس ضعیفی اور پیری میں بھی ان کے مستقل کام کرتے رہنے کی وجہ شاید ان کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی تھی جو انھیں ہمیشہ تازہ دم رکھتی تھی ۔ وہ اکثر کہتے کہ مرزا غالب نے صرف ستر (۷۰) برس کی عمر میں اظہار معذوری کر دیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس عمر میں بھی کام کاج کرنے کے لائق ہوں ۔

ان کے پاس ملاقات کی غرض سے آنے والے اردو دوست ۔ اکثر تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی جب علیک سلیک کے بعد ان سے دریافت کرتے کہ " آپ کے مزاج کیسے ہیں ؟ " ۔ تو مسعود صاحب ایک گہری اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فوراً جواب دیتے کہ " میرے کئی مزاج نہیں ہیں ۔ صرف ایک ہی مزاج ہے ۔ اور ۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ اچھا ہے " ۔ سوال کرنے والا ان کے اس جواب سے جھینپ سا جاتا ۔

ان کے ملنے والوں میں " مسعود صاحب " کہنے والوں کی بھی کمی نہ تھی جن کی اصلاح کے لئے وہ برجستہ کہہ دیا کرتے تھے کہ میرا نام " مسعود " نہیں بلکہ " مَس عُود " حسن ہے ۔

ادیب صاحب لکھنؤ کے رہنے والے ہی نہیں بلکہ یہاں کے عاشق بھی تھے۔ لکھنؤ کی سرزمین سے انھیں ہمیشہ بڑی محبت رہی۔ یہاں کی تہذیبی روایات کا وہ صدق دل سے احترام کرتے تھے۔ دراصل وہ موجودہ دور میں قدیم لکھنوی تہذیب، اخلاق، شرافت اور خلوص کے ایک پیکر مجسم اور نمائندہ کامل تھے۔

مسعود صاحب کے ذوق مطالعہ نے ہی انھیں اپنے دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کر دیا۔ انھوں نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں اور عمدہ کتابوں و مسودوں کو یکجا کرنے میں صرف کر دی۔ اسی لئے ان کا ذاتی کتب خانہ کسی بڑی لائبریری سے کم نہیں ہے۔ ان کے مسودات جمع کرنے کے ذوق نے ایسے ایسے نادر مخطوطے ڈھونڈھ نکالے جن کی دریافت اور تلاش شیر لانے سے کم نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں ان کا قول تھا کہ "اگر طلب صادق ہے تو طالب کو ہر چیز حسب دلخواہ میسر آجاتی ہے"

دراصل مسعود صاحب کے ذوق مطالعہ نے انھیں کامل ادیب بنا دیا تھا۔ انھیں موجودہ دور کے صف اول کے تنقید نگاروں اور محققوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مستقل لکھتے پڑھتے رہنے کی وجہ سے ان کی ادبی معلومات نے ایک گراں بہا ذخیرے کی شکل اختیار لی تھی۔ وہ علم کا ایک ناپیدا کنار سمندر تھے جس کی موجیں ساری دنیائے ادب کو ایک بڑے عرصے تک سیراب کرتی رہیں۔ وہ علم کا ایک گرانمایہ گنجینہ تھے اور اگر انھیں اردو ادب کی مکمل "انسائیکلوپیڈیا" کہا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔

مسعود صاحب کی دیرینہ ادبی خدمات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ساہتیہ اکادمی نے ان کی تصنیف "اردو ڈرامہ اسٹیج" پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔ صدر جمہوریہ ہند نے سند اعزاز اور دو سو پچاس روپے ماہانہ تاحیات وظیفے سے نوازا۔ اور حکومت ہند نے "پدم شری" کے خطاب سے سرفراز کیا۔